کشمیر پر حملہ

مصنّفہ

کرشنا مہتا

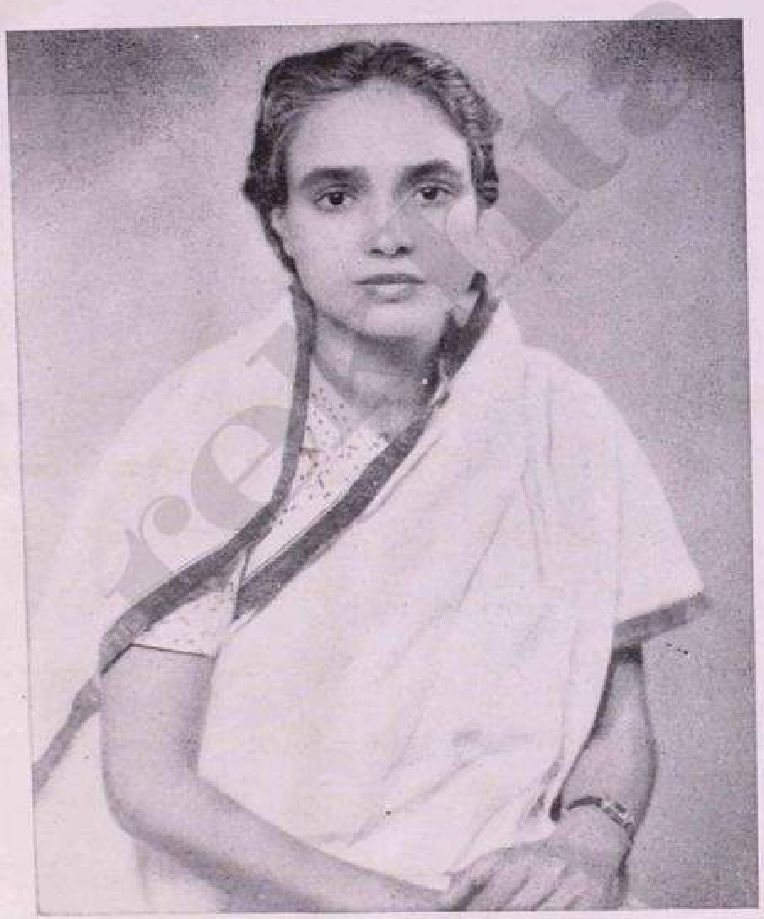
بار اول فروری ۵۲ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

برانچ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار جامع مسجد
دہلی نمبر ۶

پرنٹر

فہرست



شریمتی کرشنا مہتا کی ایک حالیہ تصویر

(۱)

طوفان سے پہلے

کشمیر کے شمال مغرب میں سرحد کے قریب مظفرآباد کا علاقہ ہے۔ قبائلی حملے سے پہلے یہ ریاست کشمیر کا ایک ضلع تھا۔ یہ چھوٹا سا علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا اور سرسبز ہے۔ اس کے بیچ میں کرشن گنگا ندی بہتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا لباس پنجابیوں سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے لوگ محنتی اور بھولے بھالے ہیں۔ قدرت کے قانون کے مطابق امیر بھی ہیں اور غریب بھی۔ اس علاقہ کے لوگ۔۔۔ زیادہ تر۔۔۔ دیکھنے میں خوبصورت اور سڈول ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ راولپنڈی کو جاتا ہے اور دوسرا ایبٹ آباد ضلع ہزارہ کو۔ یہ دونوں جگہیں پاکستان میں ہیں ریاست کشمیر کی طرف سے یہاں ایک وزیر وزارت اور کئی ایک افسر۔۔۔ سب جج اسسٹنٹ انسپکٹر پولیس۔ انجینیر اسسٹنٹ سرجن اور جنگلات کا ڈویزنل افسر۔۔۔ ہوا کرتے تھے۔

جن دنوں کی میں بات لکھ رہی ہوں وہ تقسیم ہند کا زمانہ تھا اور اندنوں حکومت کی طرف سے یہاں ایک فوج کا کرنل اور اس کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھی تھا۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں میرے شوہر شری دُنی چند مہتا کو کشمیر سرکار نے مظفرآباد کا وزیر وزارت بنا کر بھیجا۔ سرینگر میں وہ اسسٹنٹ گورنر کے عہدہ پر تھے۔ وہ جولائی میں ہی اپنا عہدہ سنبھالنے کے لئے سرینگر سے مظفرآباد گئے۔ میں اس وقت ان کے ساتھ نہ جا سکی کیوں کہ ہمارے یہاں بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ ایک ماہ بعد وہ کسی سرکاری کام سے سری نگر آتے اور واپسی پر بچوں کو ساتھ لیتے گئے۔ مجھے دو تین دن بعد آنے کو کہہ گئے کیوں کہ ہمارے مہمان بھی دو تین دن بعد جانے والے تھے۔ مظفرآباد پہنچتے ہی انہوں نے ایک ملازم کو مجھے لانے کے لئے بھیجا تاکہ راستے میں مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔

ایک ہفتہ کے بعد میں بھی مظفرآباد چلی گئی۔ میں وہاں پہنچی ضرور لیکن اس بار میرا وہاں کچھ جی نہ لگا۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہ تھی۔ کوئی ناواقف جگہ بھی نہ تھی۔ ہم وہاں چوتھی بار گئے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس بار مجھے وہاں کی ہر چیز سے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ میں حیران تھی کہ بات کیا ہے۔ دل اسقدر اداس تھا کہ سرینگر سے ساتھ لایا ہوا سامان تک بھی میں نے پورا نہ کھولا۔ کچھ ضروری چیزیں ہی کھول کر استعمال میں لاتی رہی باقی سب بندھی کی بندھی رکھی رہیں۔ دل چاہتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جاؤں۔ باتوں ہی باتوں میں میں ان سے (شری مہتا سے) اکثر کہہ بھی دیتی تھی کہ ہمیں کہیں جانا ہے یہاں نہیں رہنا ہے۔ اس لئے میں سامان نہ کھولوں گی۔

میرے شوہر ان دنوں کام میں اسقدر مصروف رہتے تھے کہ انہیں بات تک کرنے کا وقت نہ ملتا تھا۔ کرنل کے ساتھ وہ کبھی ایک سرحد پر اور کبھی دوسری

سرحد پر جاتے۔ گاؤں گاؤں گھومتے لیکن انہوں نے ہمیں کبھی یہ بھی نہیں بتایا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہماری کوٹھی کے سامنے والی پہاڑیوں پر مورچے بننے شروع ہو گئے۔ ہماری کوٹھی ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی۔ اس کے چاروں طرف کافی کھلی جگہ تھی، اس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا میدان اور باغ تھا۔ باغ اور کوٹھی کے چاروں طرف لکڑی کے تختوں کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ ہماری کوٹھی کے تھوڑی دور اسسٹنٹ انسپکٹر پولیس کی کوٹھی تھی۔ اس جگہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ہسپتال اور ڈاکٹر کی کوٹھی تھی۔ ہماری کوٹھی کے ایک طرف کچھ فاصلہ پر ایک مسجد تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی ایک زیارت گاہ کے ساتھ گھاس اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا جنگل تھا۔ پہاڑی کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ہماری کوٹھی کو اس زیارت گاہ سے ملاتی تھی۔ اس راستے پر آمد و رفت کم ہی ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی جب وہاں گدھ اور اُلو بولتے تو ان کی تلاش میں کتّے ضرور اس راستے سے گذرتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔

میرے مظفر آباد جانے کے تیسرے دن بعد جنم اشٹمی کا تیوہار آیا۔ ہم سب نے گھر میں برت رکھا۔ شام کو میں بھگوان کے درشن کے لئے مندر میں گئی۔ پوجا کا سامان اور کچھ پھل پھول لئے۔ نوکر ساتھ تھا۔ لیکن جونہی وہ دروازے پر پہنچا اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کے ساتھ ہی تھال گر پڑا۔ اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو کچھ ہونے والا ہے۔ بھگوان نے یہ خطرے کی گھنٹی دی ہے۔ دو دن تک اس واقعہ کا اثر میرے دل پر رہا۔ تیسرے دن میں سب کچھ بھول گئی۔ لیکن اس مہینے میں عجیب ہی چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ سانپ اتنے نکلتے تھے کہ ہم ان

کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ کبھی وہ بچوں کے جھولوں پر پائے گئے تو کبھی بیڈمنٹن کھیلنے کی جگہ پر۔ ایک دن تو ہمارے یہاں سوئے ہوئے دو چپراسیوں کے منہ پر ایک بڑا سانپ گر پڑا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے کاٹا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت ہر طرف سے ہمیں نگلنا چاہتی تھی۔ میں اپنے بچوں سمیت شام کے وقت ایشور کی پرارتھنا کرتی تھی اتنا مزا آتا تھا کہ ہر وقت بھجن میں ہی لگے رہنے کی خواہش رہتی تھی۔۔

میں اپنے گھر کو گرہستی کی ایک مثال سمجھتی تھی۔ میں کبھی اس سے اکتائی نہ تھی۔ ہمیں کتنی ہی اقتصادی اور دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن گھر کے مالک کا ہم پر بھروسہ تھا اس لئے ہم ہمیشہ بے فکر رہتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کسی دوسرے کے سامنے ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔ اگرچہ میرے شوہر ایک اچھے عہدے پر تھے لیکن ہماری گھریلو زندگی مزدوروں کی سی تھی۔ ہمارے گھر میں کبھی کوئی چیز مفت یا بطور رشوت نہ آتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے "میرے پاس دولت نہیں ہے۔ میرے بچے سچائی اور محنت کی کمائی پر پلے ہوئے ہیں۔ تمھیں چاہیئے کہ تم انہیں محنت کی زندگی گذارنا سکھاؤ۔ وہی ان کے کام آئے گی۔ آرام کی زندگی انسان کے لئے ایک بوجھ بن جاتی ہے۔"

بچے تو ان کی دیکھ بھال میں ایسے ہی بنے تھے لیکن میں ان کے جیتے جی اپنے آپ کو مضبوط نہ بنا سکی۔ ایک دولتمند شخص کی پہلی اولاد ہونے کے باعث میں نے اپنا بچپن آرام اور امیری میں گذارا تھا۔ نوکر نوکرانیوں میں پلی ہوئی

ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "آپ نے جو کچھ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے۔ آپ کو اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیئے، بھگوان آپ کی مدد کریں گے۔"

یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مظفر آباد سرحدی علاقہ ہونے پر بھی حکومت کی لاپرواہی کی وجہ سے غیر محفوظ تھا اور تو اور وقت پر اطلاع دینے کے ذرائع ٹیلیفون وغیرہ تک کی سہولت نہ تھی۔ ہاں یہ حکم ضرور تھا کہ لوگوں کو خوف کی وجہ سے شہر کو چھوڑنے نہ دیا جائے۔

اس وقت کی گفتگو سے مجھے کچھ کچھ معلوم ہوا کہ یہاں گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہ بھی شک گذرا کہ وہ اس بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی بات مجھ سے چھپائی نہ تھی عموماً ہر ایک بات پر وہ میری رائے لیتے تھے۔ گھر کی کھٹ پٹ میں جانتی ہی نہ تھی۔ میں نے کبھی بھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جو اُن کی خواہش یا حکم کے خلاف ہو اور انہیں بھی مجھے کبھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی مرضی کو اشاروں میں ہی سمجھ جاتے تھے۔ لیکن کچھ بھی ہو ان دنوں ان کی ہمیشہ مطمئن رہنے والی طبیعت میں کچھ جھنجھلاہٹ کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ مجھے باہر کی باتوں کا بھید نہ بتاتے تھے۔ میں بھی حیران اور پریشان تھی۔ یہی سوچ کر چپ رہتی تھی کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ ایسے ہو رہے ہیں۔ لیکن ایک طرف تو یہ حالت تھی دوسری طرف وہ اپنے باغ میں سبزیاں اور پھول لگوا رہے تھے۔ انہیں ان باتوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ گھر کی کھانے پینے کی چیزوں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ مجھے ایسی کئی باتوں میں ان سے بہت مدد ملتی تھی۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہمارے یہاں رات کے وقت فوج کے کرنل اور کپتان وغیرہ کی دعوت تھی اس دن تھوڑی تھوڑی بارش ہو رہی تھی اور اس سے کچھ کچھ سردی بھی تھی۔ رات کے دس بج گئے لیکن وہ لوگ کھانے پر نہ آئے۔ سب قریب ہی کی پولیس سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی میں بیٹھے ہوئے تھے کھانا میں نے خود پکایا تھا۔ میں نے بلوا بھیجا۔ جواب ملا کہ کپتان کہیں جیپ پر گئے ہیں ان کے آنے پر کھانا ہوگا۔ یہ ذات کے مسلمان تھے اور سرحد کی حالت کو جانچنے کے لئے گئے تھے لوٹ کر انہوں نے کہا کہ "سب ٹھیک ہے۔" کھانا کھا کر سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

رات کو ساڑھے بارہ بجے مہتا صاحب اپنے سونے کے کمرے میں آئے۔ لیٹے مگر انہیں نیند نہ آئی۔ تب وہ سب بچوں کو اٹھا لائے اور لگے سب کے ساتھ رمی (تاش کا ایک کھیل) کھیلنے۔ مجھے بھی مجبوراً کھیل میں شامل ہونا پڑا۔ پھر انہوں نے چائے منگوائی۔ میں حیران تھی کہ آج وہ یہ سب کیا کر رہے ہیں۔ میری خواہش کے برعکس اس دن انہوں نے یہ کہتے ہوئے مجھے چائے پینے پر مجبور کیا "دیکھو آج میں تمھیں چائے پینے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ کل سے تمھیں کوئی نہ کہے گا — سُنا — پیچھے پچھتاؤ گی۔" یہ سنتے ہی میرے کلیجے میں دھک دھک ہونے لگی میں نے چائے لی لیکن نہ جانے پیالی میں کیا گر پڑا میں نے جھٹ اسے پھینک دیا اور وہمی انسان کی طرح بار بار ان سے پوچھنے لگی آپ نے ابھی یہ کیا کہا تھا" وہ کہنے لگے "کچھ نہیں — منہ سے ایسے ہی بات نکل گئی"۔ بات تھی تو معمولی سی اور کہی بھی انہوں نے مذاق میں ہی تھی لیکن اس نے



شریمتی کرشنا مہتا
مظفر آباد کے ہنگامے سے پہلے

ہونے کی وجہ سے میرے دماغ میں گھمنڈ اور امیری کا بھوت سوار تھا۔ شروع میں جب میں سسرال آئی تو میں نے اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی کے مطابق تکلیفیں برداشت کرنے والی بنانا چاہا لیکن ایسا نہ کر سکی۔ دل چاہتا تھا کہ میں بھی زندگی کو ویسی ہی سخت بناؤں لیکن ایسا مجھ سے ہوتا نہ تھا۔ اکثر اوقات مجھے اپنی اس لاچاری پر رونا بھی آجاتا تھا۔

جب مظفر آباد میں میرا دل نہ لگا تو میں نے ان سے کہا "میں دو چار دن کے لئے سرینگر جانا چاہتی ہوں۔ بچے یہیں رہیں میں جلد ہی لوٹ آؤں گی" پہلے تو وہ مان گئے اور سیٹ کا انتظام بھی کر دیا لیکن بعد میں کہنے لگے "ابھی نہ جاؤ میں کچھ فوجی افسروں کو دعوت پر بلانا چاہتا ہوں۔ یہ کام کر کے تم چلی جانا"

اور کچھ دن یوں ہی گذر گئے۔۔۔ ایک دن انہوں نے باہر سے آتے ہی کہا "سنو، آج کرنل صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں اپنے بچوں کو سرینگر بھیج دوں اور خود ان کے یہاں جا کر رہوں۔ کرنل یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ددمیّل میں۔۔۔ جہاں پر وہ رہتے تھے۔۔۔ جیپ اور فون وغیرہ کا خاصا انتظام ہے۔ خبر دینے اور آنے جانے کے ذرائع کی ضرورت پڑنے پر بھی پریشان نہ ہونا پڑیگا" میں نے پوچھا "تو آپ نے انھیں کیا جواب دیا؟" وہ بولے "میں نے کرنل سے کہہ دیا ہے کہ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ میں جنتا کو تو حکومت کی ہدایت کے مطابق یہاں سے باہر نہ جانے دوں اور اپنے خاندان کو بھیج دوں۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو جو حال ساری جنتا کا ہوگا وہی میرے بیوی بچوں کا بھی ہوگا۔ میں اپنے فرض سے بچنا نہیں چاہتا"
یہ سن کر میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا اور عقیدت سے میرا سر جھک گیا میں نے

میرے دل میں شدید درد پیدا کر دیا۔ میں نے کھیل بند کر دیا۔ سب کو بند کرنا پڑا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے مجھے آواز دی کہ بچوں کو کمرے میں سلا کر بے بی کو میرے پاس لے آؤ (بے بی میرا سب سے چھوٹا لڑکا ہے۔ اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی) وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ میں اسے اٹھا کر لے آئی اور لے ان کی چارپائی پر سلا دیا۔ سوتے ہوئے بے بی کو دیکھ کر وہ کہنے لگے "دیکھو یہ کیسا مست سو رہا ہے" میں نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ میں ان کی اس دن کی گفتگو اور حرکات کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی تھی کہ آخر یہ کر کیا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی گہری نیند میں سو گئے۔

(۲)

طوفان آگیا

صبح کے پانچ بجے ہوں گے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں نے سنا گولیوں کی بھیانک آواز پہاڑ کی طرف سے چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر آ رہی ہے۔ میں فوراً ان کی چارپائی کے پاس جا کر انہیں جگانے لگی۔ لیکن وہ اتنی گہری نیند میں تھے کہ کئی آوازوں کے بعد جاگے۔ میرے منہ سے اچانک یہ الفاظ نکلے "حملہ ہو گیا۔ آپ اٹھتے کیوں نہیں"، (حالانکہ مجھے کچھ خبر نہ تھی) انہوں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "

یہ حملہ نہیں ہے۔ ہماری فوج چاند ماری کر رہی ہو گی۔ میں نے جلدی سے ان سے پوچھا "کیا رات کرنل نے چاند ماری کے سلسلہ میں آپ سے کچھ کہا تھا؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں تو" میں نے بڑبڑا کر کہا "پھر تو حملہ ہی ہوا ہے۔ آپ اٹھئے سوچ کیا رہے ہیں؟" انہیں پھر بھی یقین نہ آ رہا تھا۔ میرے اصرار پر وہ اٹھے اور انھوں نے باہر جا کر میدان میں جو کچھ دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ گولیاں دنادن ہماری ہی کوٹھی کی طرف آ رہی ہیں اور لکڑی کے جنگلے سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ میں نے کہا "آپ ذرا بچ کر جائیے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں گولی لگ جائے" انھوں نے جلدی میں مختصر سا جواب دیا "مجھے گولی نہیں لگتی" اتنا کہہ کر اور کپڑے پہن کر وہ باہر نکل آئے۔

میں بچوں کو ساتھ لے کر برامدے میں آئی اور جدھر سے گولیاں آ رہی تھیں ادھر دیکھنے لگی۔ ہمیں کوئی آدمی نظر نہ آ رہا تھا لیکن گولیوں کی بوچھار مسلسل آتی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ گولیاں جنگلے کے تختوں کو چیر کر اندر تک آ رہی تھیں لیکن بچوں کے دل میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔ وہ زور زور سے ہنس رہے تھے میں نے بچوں سے کہا "جا کر کپڑے پہن آؤ۔ سردی لگنے کا ڈر ہے" رات کو کچھ بارش ہو جانے کے باعث سردی ہو گئی تھی۔ میرے دونوں لڑکے، جن میں ایک کی عمر سات برس اور دوسرے کی ساڑھے آٹھ برس تھی جا کر تھوڑی دیر میں ہی کپڑے پہن آئے۔ بڑے نے بش شرٹ پہن رکھی تھی۔ چھوٹے نے ایک سوئٹر پہن رکھا تھا ننگے پاؤں وہ پھر دوڑے دوڑے برامدے میں آئے۔ چاروں لڑکیاں بھی بر انے "بل اوور" پہن کر ننگے پاؤں ہی تماشہ دیکھنے آگئیں۔ ان میں ایک میرے جیٹھ کی لڑکی تھی جو کچھ عرصہ پہلے میرے پاس سرینگر میں آئی تھی اور ہمارا تبادلہ ہونے پر میرے ساتھ یہاں

چلی آئی تھی۔ اس چودہ سالہ لڑکی کا نام سودیش تھا۔ میری بڑی لڑکی بینا ساڑھے چودہ برس کی تھی۔ منجھلی شیلا ساڑھے دس برس کی اور سب سے چھوٹی کملیش نو برس کی تھی۔ یہ سب معصوم بچے گولیوں کی آواز پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے نہ جانے کیوں میرے دل میں بھی اس وقت زیادہ گھبراہٹ نہ تھی! میں بھی بچوں کے ساتھ وہ منظر دیکھتی رہی۔ جب گولیوں کی شدت اور بڑھی تب میں نے بچوں کو اندر جانے کے لئے کہا لیکن وہ ایک نہ مانے اور مجھے ہی ڈرپوک بتلانے لگے۔

اُدھر ہم ان باتوں میں لگے تھے اِدھر گراونڈ کے باہر سب انسپکٹر پولیس تیئس سپاہیوں کو ساتھ لئے مہتا صاحب سے آملا۔ ان سپاہیوں میں بیس مسلمان تھے اور تین ہندو سب انسپکٹر خود ہندو راجپوت تھا۔ وزیر صاحب کو انھوں نے بتایا کہ حملہ ہو گیا ہے اور دشمن کرشن گنگا کا پل پار کر کے شہر کے نزدیک آ رہے ہیں۔ اتنے میں وہ اندر آئے۔ میں نے ان سے پوچھا "آپ دو تین جا کر فوج کیوں نہیں بلا رہے ہیں؟" وہ بولے "گولیاں تیزی سے چل رہی ہیں کچھ تھم جائیں تو دو تیک جاؤں۔ تم بچوں کو چاتے وغیرہ تو دو" اتنا کہہ کر وہ پھر تیزی سے باہر نکل گئے اور اس کے بعد واپس نہیں لوٹے۔ میری ان سے یہ آخری ملاقات اور آخری گفتگو تھی۔ ہاں، باہر جاتے جاتے بچوں کو دیکھ کر بڑے زور سے ہنسے اور بولے "دیکھو، میرے بچے گولیوں کی آواز سن کر ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ نڈر ہو کر ہنس رہے ہیں۔ انہیں ایسا ہی ہونا چاہیئے"

اس بھیانک مصیبت کے وقت کوٹھی کے سب ملازم تتر بتر ہو گئے تھے۔

میرے پاس صرف میرا ایک نوکر اوم پرکاش رہا۔ وہ ہمارے ہی علاقے کا تھا اور بڑا قابلِ اعتماد خدمت گار تھا۔

ہم سب پریشان تھے کہ کیا کریں۔ شہر میں چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ گولیوں کی بوچھار، لوگوں کی آہ وبکا سے دل دہل رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے کسی شخص نے آ کر کہا "حملہ آور ہسپتال تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں آگ لگاتے ہیں۔ ہسپتال میں آگ لگا دی گئی ہے۔ بچارے بے بس مریض اندر ہی جل رہے ہیں" یہ سن کر میں سہمی۔ ہسپتال بالکل قریب تھا۔ میں نے بچوں کو اندر کمرے میں کر لیا۔ ہماری کوٹھی ایک منزلہ تھی۔ دونوں طرف برامدے تھے۔ رسوئی پیچھے کی طرف تھی اور اسی طرف سے پوجا کے کمرے میں سے ہو کر پیچھے زیارت گاہ والی پگڈنڈی کے سامنے ایک دروازہ کھلتا تھا۔ میں نے جلدی میں نہ جانے کیا سوچ کر زیور اتارے اور ایک پوٹلی میں باندھ لئے۔ اس وقت میرے تن پر سب سے پرانے اور ہلکے کپڑے تھے۔ اس وقت میں نے یہ سوچا تک نہیں کہ کوئی مضبوط کپڑا پہنوں۔

میں ابھی بمشکل اندر گئی تھی کہ آواز آئی "سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی جل رہی ہے" اب میرے ہوش اڑے کہ کیا کیا جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پچھلے دروازے سے ہمارے ایک مسلمان چپراسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ حملہ آور آپ کے سونے کے کمرے کا دروازہ توڑ رہے ہیں۔ وہ لگ بھگ سات سو آدمی ہیں۔ آپ مہربانی کر کے بچوں سمیت باہر آ جائیے۔ ہم زیارت گاہ والی پگڈنڈی پر کہیں ان بچوں کو چھپا دیں گے" گھبراہٹ میں میں نے اس سے پوچھا "مہتا صاحب

کہاں ہیں؟" وہ کہنے لگا "وہ مورچے پر گئے ہیں اور محفوظ ہیں۔ آپ جلدی آیئے" میں ہواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ ایک طرف تو میں نے سوچا کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مجھ پر بچوں کی حفاظت کا بار ہے۔ کسی بھی طرح ان کی حفاظت کر کے مجھے یہ فرض پورا کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف میرے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ ان کی غیر حاضری میں گھر چھوڑنا اچھا نہیں ہے۔ آخر میں ہندوستانی عورت تھی۔ میں اسی تذبذب میں تھی کہ باہر سے وہ پھر ہڑبڑا کر بولا "جلدی کیجئے نہیں تو غضب ہو جائے گا۔ یہ لوگ بری طرح سے مار کاٹ کرتے آ رہے ہیں۔" یہ سن کر مجھ سے نہ رہا گیا ننگے پاؤں خالی ہاتھ ایک چادر اور ایک گپتی ساتھ لئے بچوں کو لے کر، میں اس بھرے گھر سے، سب کچھ چھوڑ کر چل دی۔ گپتی اس لئے ساتھ رکھی کہ اگر کہیں کبھی ان معصوم بچوں کی عزت پر حملہ ہو تو اس سے پہلے کہ وہ بے عزت ہوں اس گپتی سے وہ ہمیشہ کی نیند سو کر اپنی عزت کی حفاظت کر سکیں۔

باہر نکلتے ہی ہم زیارت گاہ والی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ جاتی بار میں نے اس اجڑی ہوئی بستی پر ایک نگاہ ڈالی جہاں کچھ ہی لمحے پہلے میری سکھ بھری گرہستی بسی ہوئی تھی اور اب ڈراونی تاریکی چھاتی جا رہی تھی۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں اتنی زور سے کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ اس وقت ہم اس ناقابل گذر پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ پاؤں پھسل جاتا تو گر کر لاش کے سب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ تھوڑی دور چل کر ہم گھاس پر سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تبھی زوروں سے بارش ہونے لگی۔ جو کچھ کپڑے ہمارے بدن پر تھے وہ بھی بھیگ گئے۔ بچے سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔ میں نے

ان کے اوپر چادر ڈال دی وہ بیچارے اس میں دبک کر بیٹھے رہے۔

اب گولیوں کی آواز اور بھی نزدیک سے آنے لگی۔ میں ایک انجان راہی کی طرح وہاں بیٹھی تھی کہ ہسپتال کا ایک بوڑھا ملازم چرن گھبرایا ہوا قریب سے گذرا میں نے پوچھا "بھیا! تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" وہ بولا "میرا بارہ برس کا ایک لڑکا ہسپتال میں تھا اور وہ اب جل رہا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں جتنے مریض تھے وہ سب اس کے ساتھ جل رہے ہیں۔ نہ جانے میرا بچہ کہاں ہوگا؟" یہ کہتے ہوئے ممتا بھرا دل لئے وہ دوڑتا ہوا ہسپتال کی طرف چلا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی لاش ہسپتال کے قریب پڑی ہوئی دیکھی گئی تھی اور اس کی گود میں اس کا جھلسا ہوا مردہ بچہ تھا۔

ہم لگ بھگ ڈھائی گھنٹہ وہیں پڑے رہے۔ سردی کے باعث بچوں کا رنگ اڑ گیا جیسے ان میں خون ہی نہ تھا اتنے میں ہمیں ڈھونڈتا ہوا اوم وہاں آگیا۔ وہ رو رہا تھا میں نے ایکدم اس سے پوچھا "اوم تم کہاں تھے، رو کیوں رہے ہو؟" بچے اسے روتا دیکھ کر ہنسنے لگے "واہ اوم! تم کتنے ڈرپوک ہو۔ دیکھو ہم نہیں ڈرتے۔ تم تو کہتے تھے کہ تم کسی سے نہیں ڈرتے۔ اب تمھیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ بزدل بنے رو رہے ہو۔ وہ کچھ نہیں بولا میں نے اس سے پھر پوچھا "بات کیا ہے؟ بتاؤ تو، تم اتنا کیوں رو رہے ہو؟" وہ ذرا رک کر بولا "جب آپ یہاں آئیں تو میں کوٹھی میں ہی تھا۔ سات قبائلی وہاں آئے اور سب زیورات اور قیمتی کپڑے نکال کر لے گئے اور صاحب کے کپڑے بھی الماری میں سے نکال کر پہن رہے تھے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "بس اسی پر تم اتنا رو رہے ہو۔ بھائی کپڑے اور

چلتے چلتے ہم ایک نالے پر پہنچے۔ سامنے سے دس گیارہ آدمی ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ ہم سب سے آگے سریش تھا۔ انہوں نے اسے روک کر پوچھا "بتا تو کس کا لڑکا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟" سریش نے جواب دیا "میں یہاں کے وزیر کا لڑکا ہوں" وہ جانتا تھا کہ ایسا کہنے میں خطرے کا ڈر تھا لیکن اسے ہمیشہ سچ بولنے کی تعلیم ملی تھی۔ اس لئے وہ جھوٹ نہ بول سکا۔ یہ جواب سنتے ہی انہوں نے کہا "ہاں ہاں تم سب جلدی جلدی جاؤ۔ تمہارے لئے وزیر صاحب نے نوابہ چپراسی کے یہاں ٹھہرنے کا انتظام کیا ہے' یہ نوابہ تحصیل کا چپراسی تھا۔ گرتے پڑتے ہم سب نوابہ کے گھر پہنچے۔ یہ مکان ہماری کوٹھی سے نصف میل کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ پر تھا جہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔

میرے وہاں پہنچتے ہی اس کا سارا خاندان اور شہر کے کئی مسلمان جو بھاگ کر یہاں آئے تھے باہر نکلے اور مجھے بڑی عزت سے اندر لے گئے۔ کہنے لگے "تو ہمارے نیک حاکم کی بیوی ہے ہماری آنکھوں میں تیری عزت ویسی ہی قائم ہے۔ گھر اپنا ہے۔ بیٹھئے" میں اندر آ گئی کئی عورتوں نے میرے بچوں کی حالت دیکھ کر آنسو بہائے اور حملہ آوروں کو جلی کٹی سنانے لگیں۔ میں نے ان لوگوں سے مہتا صاحب کے بارے میں پوچھا "وہ کہاں ہیں؟" وہ بے رخی سے بولے "ہمیں معلوم نہیں کہاں ہیں" کچھ دیر بعد وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس کا اردلی شیو دیال آیا۔ یہ بارہ مولا کا رہنے والا تھا۔ ہماری کوٹھی پر اکثر آیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ اوم سے ملا۔ دونوں کچھ بات چیت کرنے لگے۔ میں نے شیو دیال سے پوچھا "بھائی! تمہیں معلوم ہے کہ مہتا صاحب کہاں ہیں؟ تم تو وہیں تھے جب وہ گھر سے باہر نکلے تھے" وہ بولا

زیور ہم نے ہی تو بنوائے تھے۔ زندہ رہے تو پھر بنوا لیں گے۔ لیکن ہاں ایک بات سنو اگر تم کوٹھی میں جا کر صاحب کا گرم سوٹ لا سکو تو اچھا ہوگا۔ وہ صبح ٹھنڈے کپڑوں میں ہی گئے ہیں۔ انہیں سردی لگ رہی ہوگی" یہ سنتے ہی اس نے ایک آہ بھری اور جانے کے لئے اٹھا۔ لیکن کچھ دور چل کر پھر لوٹ آیا۔ کہنے لگا "میں نہیں جا سکتا۔ جب میں یہاں آ رہا تھا تو کوٹھی میں سے کسی کے کراہنے کی سی آواز سنی تھی" اتنا کہتے کہتے وہ اچانک رک گیا۔ تب نہ جانے کیا سوچ کر میں نے بھی اس سے کہا "اچھا رہنے دو" اتنے میں ہماری کوٹھی جلتی ہوئی دکھائی دی ہمارے ساتھ کے چپراسی نے کہا "دیکھئے آپ کا گھر جل رہا ہے" یہ دیکھ کر میری چھوٹی لڑکی کملیش گھبرا کر کہنے لگی "ماتا جی، میں کیا کروں؟ میری گڑیوں کا گھر جل رہا ہوگا اور بیچ میں بیچاری گڑیاں بھی جل گئی ہوں گی" ننھی بچی تو گڑیوں کی ہی دنیا سے واقف تھی لیکن میں یہ دیکھ کر سن سے رہ گئی "ہے بھگوان، اب میں کیا کروں؟ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟ اب میں ان ننھے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں"؟ ادھر میری پریشانی بڑھ رہی تھی ادھر اب بچوں کی ہنسی غائب تھی۔ انھیں معلوم ہو رہا تھا کہ مصیبت آ رہی ہے لیکن وہ خاموش تھے۔ چپراسی کہنے لگا "ماتا جی، چلئے میں آپ کو کہیں محفوظ جگہ پہنچا آؤں نہیں تو یہ بچے مارے سردی کے مر جائیں گے اور اگر حملہ آور کبھی آپ سب کو ڈھونڈتے ادھر آ نکلے تو کیا ہوگا۔ ہمیں یہاں سے چلنا چاہیئے۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا سب کچھ گنوا کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے چل پڑے۔ بچے چل رہے تھے ننگے پاؤں کر جلتے ہوئے گھر کے کالے دھوئیں کو آسمان سے باتیں کرتے دیکھتے ہوئے آہیں بھرنے کے سوا اب ہمارے پاس دھرا ہی کیا تھا۔

وہ صاحب (سپرنٹنڈنٹ پولیس) کے ساتھ تینتیس سپاہی ے کرہائی اسکول کی طرف گئے ہیں۔ وہاں فوجیوں نے کئی دن پہلے ایک توپ گاڑی رکھی ہے اور وہ وہاں محفوظ ہیں۔"

ادھر بچے مارے سردی کے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر نوابہ کی عورت نے آگ جلائی۔ میں نے بچوں کے گیلے کپڑے اتار اتار کر اس پر سکھائے اچھی طرح تو کیا سوکھتے پھر بھی کچھ فرق ضرور پڑا۔

وہاں سے شہر کے جلنے کا بھیانک منظر دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے۔ چاروں طرف چیخ و پکار کی آوازیں تھیں۔ پہاڑیوں پر لوگ اپنے بیوی بچوں سمیت بھاگتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آسمان دھوئیں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جہاں میں تھی وہاں پر بھی بہت سے آدمی آس پاس سے آکر جمع ہو گئے۔ میں پاگلوں کی طرح ہر ایک شخص سے جج صاحب کا حال پوچھتی تھی۔ کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ صحیح جواب کوئی نہ دیتا تھا۔ آنے والے بس اتنا کہتے جاتے تھے کہ حملہ آور مردوں کو قتل کر رہے ہیں اور عورتوں اور لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کرلے جا رہے ہیں۔ جس مکان میں گھستے ہیں لوٹ کر پھر اس میں آگ لگا دیتے ہیں۔

چار بج گئے۔ بچوں نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوک سے وہ نڈھال ہو رہے تھے۔ گھر کی مالکن نے یہ دیکھ کر مکئی کے آٹے کی ایک روٹی بنائی اور بچوں کے لئے مجھے دی۔ میں نے اس روٹی کے چھ حصے کئے اور ہر بچے کو ایک حصہ دے دیا۔

(۳)

بیچ بھنور میں

رات کے دس بجے تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ دس بجے نوابہ آیا اور اپنی عورت کو باہر بلا کر کچھ کہنے لگا۔ وہ جب لوٹ کر آئی تو مجھ سے کہنے لگی "آپ ہمارے یہاں سے ابھی چلے جائیے۔ آپ یہاں نہیں رہ سکتیں۔ حملہ آور یہاں آکر ہمیں تمھیں پناہ دینے پر مار دیں گے" میں نے کہا "میں اس اندھیری رات میں کہاں جاؤں۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی" لیکن اس نے میری ایک بات نہیں سنی اتنے میں اس کے شوہر نے بھی اندر آکر کہا "آپ یہاں سے جلدی چلے جائیے۔ وزیر صاحب اور پولیس سپرنٹنڈنٹ دونوں جیپ میں اُڑی گئے ہیں" مجھے اس کی یہ بات من گھڑت معلوم ہوئی۔ میں نے فوراً اس سے کہا "تو غلط کہتا ہے وہ ایسے بھاگنے والے نہیں" اس نے جھٹ قرآن پاک کی قسم کھا کر کہا "نہیں وہ اُوڑی گئے ہیں۔"

میں جب دن میں یہاں آئی تھی تب انھوں نے مجھے عزت سے بٹھایا تھا لیکن اب رات کے گہرے اندھیرے میں وہ مجھے نکال رہے تھے۔ میں نے دل ہی

دل میں کہا "انسان اتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ ابھی دیوتا ہوتا ہے تو ابھی راکشش بن جاتا ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ لاچار ہو کر میں نے اس سے کہا " اگر تمھیں میری وجہ سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہے تو میں ابھی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ جو ہوگا برداشت کروں گی۔ لیکن اپنے لیے کسی کو مصیبت میں نہ ڈالوں گی۔ پر ایک بات ہے تمھیں ہمارے ساتھ آنا ہوگا میں اپنی کوٹھی کے چوکیدار کے گھر جانا چاہتی ہوں" وہ کچھ دن پہلے چھٹی پر گیا تھا۔ ذات کا مسلمان تھا اور بڑا نیک دل تھا۔ اس کا گھر یہاں سے کافی دور تھا نوابہ کہنے لگا اچھا میں جوگیوں کے گاؤں تک تو پہنچا آؤں گا صبح وہاں کا نمبردار آپ کو اس چوکیدار کے گاؤں تک پہنچا دے گا۔ یہ جوگیوں کا گاؤں مشہور غنڈوں کا گھر تھا۔ میں اس کے کہنے کے ڈھنگ سے اس کی شرارت بھانپ گئی اس لئے میں نے اپنے ساتھ اوم اور ضیو دیال کو لیا۔ ان کے علاوہ وہ چپراسی جو ہمیں کوٹھی سے نکال کر لایا تھا ساتھ آیا۔

راستہ پہاڑی تھا۔ کانٹوں اور کنکروں سے بھرپور۔ اتنا بھیانک کہ پاؤں پھسلہ اور ہڈی پسلی چور۔ اس پر خونخوار درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سامنے شہر جلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں جلتے ہوئے مکان سیاہ بھوتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں۔

میں اپنے اس چھوٹے سے قافلے میں سب سے پیچھے تھی۔ یہ ہمارے مصائب سفر کا آغاز تھا۔ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے ہم اس بھیانک رات میں چل رہے تھے۔ کچھ دور چل کر ہم ایک پہاڑی بستی پر چڑھے نوابہ نے وہاں ایک آدمی کو بلا کر کہا "بھائی ہم صبح تک تمھارے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں" اس نے ہمیں اپنے یہاں ٹھہرالیا۔

اصل میں وہ اس کا کوئی رشتہ دار تھا۔ بچے اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ آگے چلنے کی ان میں ذرہ برابر طاقت نہ تھی۔ بیچارے پہلے ہی سردی سے بے حد پریشان تھے۔ اس پر کپڑے کچھ کچھ بھیگے تھے۔ اس لئے ان کے دانت بج رہے تھے۔ گھر والوں نے ایک کھاٹ اور ایک رضائی دی۔ بچوں کو ایک موٹی سی مکئی کی روٹی بھی کھانے کو دی۔ میں نے لینے سے انکار کرنا چاہا لیکن بچوں کی للچائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میں ایسا نہ کر سکی۔ لاچار میں نے روٹی لے کر بچوں میں بانٹ دی۔ اُسے کھا کر وہ کھاٹ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ میں بھی بچوں کے پاس پڑی رہی۔ جو رضائی ہمیں اوڑھنے کو ملی تھی اگر کچھ وقت پہلے ... وہ ہمیں کہیں کوٹھی کے آس پاس پڑی ہوئی ملتی تو اسے دور پھنکوانا تو معمولی بات تھی ہم اس جگہ تک کو صاف کروالتے لیکن اب حالت یہ تھی کہ اسی رضائی کے لئے ہمیں دل سے ان کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

اس کمرے میں بہت سے تیز دھار والے بھالے چمک رہے تھے انہیں دیکھ کر دل دہل اٹھتا تھا۔ ہم تقریباً آدھ گھنٹہ لیٹے ہوں گے۔ کہ مجھے باہر سے کچھ آدمیوں کی کانا پھوسی کی آوازیں سنائی دی۔ میں اٹھی اور کواڑ کھول کر دیکھنے لگی۔ وہاں تین اشخاص آپس میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوابہ تھا۔ باقی دونوں سے میں واقف نہ تھی۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں پینی دھار کا بھالہ تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک کلہاڑا۔ میں نے ان سے پوچھا "تم کیا مشورہ کر رہے ہو" نوابہ اٹھا اور جلدی سے کہنے لگا "آپ یہاں بھی نہیں رہ سکتیں کیونکہ صبح یہاں پر بھی حملہ آور آنے والے ہیں۔ آپ کی وجہ سے یہ انھیں بھی تباہ کر دیں گے آپ کو ابھی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یہ

سن کر میرا سر چکرا اٹھا۔ صبح سے میں نے پانی تک نہ پیا تھا پریشانیاں اتنی تھیں کہ کچھ سوجھتا نہ تھا پھر بھی۔ ان پر ہماری وجہ سے کوئی مصیبت نہ آئے۔ یہ خیال ضرور آیا۔ اسی وجہ سے میں نے جواب دیا "مجھے راستہ معلوم نہیں ہے تمھیں ساتھ چلنا پڑے گا" وہ کہنے لگا "میں تو نہیں چل سکتا۔ میرے بچے اکیلے ہیں۔ ہاں میں یہاں سے ایک آدمی آپ کے ساتھ کردوں گا۔ لیکن آپ کو اسے بیس روپے دینے ہوں گے۔" میں نے کہا "بھائی میں گھر سے بیس پیسے بھی لے کر نہیں چلی۔ بیس روپے کہاں سے دوں،" وہ بولا "لیکن اسے اس سے کیا۔ وہ تو روپیہ لے گا۔ آپ کہیں سے دیں" میں حیران تھی کہ روپے کہاں سے دوں۔ ہم میں سے کسی کے پاس روپے نہ تھے۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ وہ شخص اس وقت اتنا سنگدل بن گیا کہ اس نے صاف صاف کہہ دیا "پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا آپ یہاں سے نکل جائیں،" ایک دم میرا دھیان زیوروں کی طرف گیا، میں نے کان کا ایک زیور (ماپس) اُسے دکھایا اور کہا "یہ لو، میں تمھیں یہ دیتی ہوں،" بس پیسے نے اسے جکڑ لیا۔ وہ فوراً باہر سے ایک شخص کو لایا اور بولا "اسے دے دیں" میں نے کہا "یہاں تو میں نہ دوں گی۔ ٹھکانے پر پہنچ کر ہی دوں گی" وہ چاہتے تو سب کچھ چھین کر مجھے نکال دیتے لیکن انہیں اس بات کا خیال نہیں رہا کہ میرے پاس کچھ اور بھی ہے۔ میں نے بچوں کو جگایا، بچارے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آنے والی مصیبت کا راستہ دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے کہا "اٹھو چلیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مصیبت کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض ہے"

ہم اس نئے آدمی کے ساتھ چل پڑے۔ نوابہ ساتھ نہیں آیا۔ رات کے

ایک بجے ہم سب اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوتے جارہے تھے۔ وہاں سڑک نہیں تھی۔ کانٹوں اور کنکروں سے بھرپور پہاڑی پگڈنڈی تھی۔ بھگوان کی کرپا سے ہمیں کہیں کانٹا بھی چبھا اور نہ کوئی ٹھوکر ہی لگی۔

کچھ دور چلنے کے بعد پیچھے سے ہمیں ایک آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑکر دیکھا ایک سکھ نوجوان ٹارچ جلائے ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ میرے ساتھی اسے پہچانتے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھا "کہاں جارہے ہو؟" اس نے ایک مشہور سکھ سردار کا نام لیتے ہوئے کہا "وہ اور اس کے گھر کے لوگ اس راستے سے بھاگ رہے تھے کہ ان کا دس سال کا بچہ پہاڑی پر سے گر پڑا۔ اس کی حالت بُری پر درد ہے کچھ دیر کا مہمان ہے۔ آپ بھی اپنے بچوں کو حفاظت سے لے جائیے۔" میں اس وقت کیا کرسکتی تھی۔ چاروں طرف موت ہی موت دکھائی دے رہی تھی۔ سب بچے آگے تھے اور میں سب سے پیچھے تھی۔ اندھیرے میں کبھی کبھی ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے تھے۔ تب بڑا پریشان ہونا پڑتا تھا۔

چلتے چلتے شیودیال قریب آکر کہنے لگا "میں کچھ آگے گیا تھا۔ وہاں کچھ ہندو ملے تھے ان کے ساتھ مظفر آباد کا ایک مشہور رئیس بھی ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تم لوگ اپنا بھلا چاہتے ہو تو اپنے ساتھی مسلمانوں کو الگ کردو اور ہمارے ساتھ آؤ۔ اس نے مجھے ان لوگوں کی بات کو مان لینے کے لئے کہا۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا اور مسلمان بھائی سے کہا "بھائی! اب تم جاؤ۔ اپنے بال بچوں کو سنبھالو۔ ہمیں جہاں قسمت لے جائے گی چلے جائیں گے" اور وعدہ کے مطابق میں نے کان کا زیور اسے دے دیا۔ اس نے خوشی سے اسے

لے لیا اور بڑے ادب سے سلام کر کے لوٹ گیا۔ جاتے ہوئے ایک پُردرد نگاہ اس نے میرے اور میرے بچوں پر ڈالی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ہمارے دکھ سے دکھی تھا۔ انسانی دل کے کتنے رنگ ہیں۔

ہم کچھ آگے بڑھے۔ دیکھا کہ کچھ مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک قافلہ جا رہا ہے۔ ہم بھی اس کے ساتھ آ ملے۔ راستے میں ایک مرد نے میرے چھوٹے بچے پر رحم کھا کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ چلتے چلتے ہم ایک جگہ پر پہنچے۔ اس جگہ کا نام "بوتھا" تھا۔ وہاں ایک گوردوارہ تھا۔ ہم سب اسی میں ٹھہرے۔ ہم سے پہلے وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مارے پیاس کے جان نکل رہی تھی۔ ساتھ والے آدمیوں نے تھوڑا سا پانی پلایا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے ایک ایک کر کے سب آدمی چلے گئے کسی نے ہمیں ساتھ چلنے کے لئے نہ کہا ہم نے بھی ساتھ والوں کو ڈھونڈا لیکن وہاں تو ہر ایک کو آپا دھاپی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے شیو دیال سے کہا "بھائی تم بھی ساتھ نہ چھوڑ دینا۔ کہیں ٹھکانے پر پہنچا کر ہی جانا" وہ بولا "ماں میں جب تک ہوں کبھی اس دکھ میں تمھارا اور ان بچوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا" میں نے اس سے کہا "ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیئے کیوں کہ وہ لوگ گوردوارے کو جلانے کے لئے تڑکے ہی آئیں گے۔ ہمیں کہیں آگے چلنا چاہیئے"۔ لیکن ہم کہاں جائیں، کس راستے سے جائیں اس کا ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ پھر بھی وہاں رہنا ہم نے مناسب نہ سمجھا۔ ہم اٹھے اور چل کھڑے ہوئے۔ جو راستہ سامنے دکھائی دیا۔ اسے ہی ہم نے پکڑ لیا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد تھوڑی روشنی ہونے لگی۔ ہم لگاتار چلتے گئے۔ آگے ایک پہاڑی پر چلتے ہوئے ہمیں لاٹھیاں لئے ہوئے کچھ لوگ دکھائی دیے۔ انھوں نے ہمیں پہاڑی پر چڑھنے سے روکا۔ کہنے لگے "تم کہاں جا رہے ہو؟" ہم نے چوکیدار کے گاؤں کا نام بتایا۔ انھوں نے کہا "خبردار! آگے ایک قدم نہ رکھنا۔ سرکار کا حکم ہے کہ کوئی اس راستے سے نہ جائے" ہم وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔ پوچھا "ہم کہاں جائیں" لیکن انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ سب مظفرآباد کے کسان تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ہمیں لاٹھیاں مار مار کر وہیں ڈھیر کر دیتے لیکن نہ جانے کیوں ان کا ہاتھ ہم پر نہ اٹھا۔ انھوں نے ہمیں جانے نہیں دیا۔ ہم چڑھائی سے نیچے اترنے لگے۔ اب ہم میں ایک قدم چلنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ سردی کے مارے بچوں کا رنگ پیلا ہو گیا تھا اور دانت کٹکٹا رہے تھے۔

نیچے اتر کر ہمیں ایک بوڑھا مسلمان ملا۔ میں نے اس سے کہا "بابا اگر تم ایک گھنٹے کے لئے ہمیں اپنے گھر لے چلو تو بڑا احسان ہوگا یہ بچے ہاتھ گرما لیں گے" اسے کچھ رحم آیا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر مظفرآباد سے تقریباً دس میل دور تھا۔ وہ ایک غریب کسان تھا۔ اس کے مکان کے اگلے حصے میں ایک برامدہ تھا کمرے میں ایک طرف گائے بھینس بندھی ہوئی تھیں۔ اسی میں ایک طرف چولہا تھا۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن تھے اور دو چار پھٹے پرانے لحاف۔ دو ایک چارپائیاں بھی تھیں۔ ایک تلوار بھی کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ اس کے خاندان میں دو لڑکے تھے تین لڑکیاں اور گھروالی تھی۔ اندر لے جا کر اس نے ہمیں عزت

سے بٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا" یہ ہمارے مہمان ہیں ۔ ان کا ادب کرنا ہمارا فرض ہے۔ دیکھو تو ان کی کیا حالت ہے ؟ خدا رحم کرے" بچے آگ دیکھتے ہی چولہے سے چمٹ گئے ۔ ہم سب نے ہاتھ گرمائے ۔ اس کا لڑکا میرے بڑے لڑکے کا ہم جماعت نکلا ۔ اس نے باپ سے جاکر کہا کہ یہ وزیر صاحب کا لڑکا ہے وہ دونوں آپس میں گلے ملے ۔ اس وقت ان معصوم بچوں کا کیسا عجیب ملاپ تھا۔ اب اس کی ماں ہمارے لئے کھانا پکانے کی فکر کرنے لگی اس نے چائے اور مکئی کی روٹی بنائی ۔ ساتھ ہی کچھ بھٹے بھون کر دئے ۔ بچوں نے چائے پی اور روٹی کھائی ۔ میں نے صرف بھٹے کے کچھ دانے کھائے دل تو کسی چیز کو کھانے کو نہ چاہتا تھا لیکن کھائے اس لئے کہ میرے دانت بھی حرکت نہیں کر رہے تھے ۔ ہمیں وہاں پہنچ کر اتنا سکھ ملا کہ میں بیان نہیں کر سکتی ۔

وہ کھانا بنانے لگے ۔ مجھ سے پوچھا" تم سب ہمارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤ گے بھی یا نہیں ؟ اگر نہیں تو خود بناؤ" میں نے کہا کہ مجھے اس سے پرہیز نہیں ہے ۔ لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی ۔ بچے کھا لیں گے ۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ انھوں نے نکالا اور پکایا لیکن غریب کی جھونپڑی میں اتنا کہاں کہ سب کا پیٹ بھر جائے ۔ پھر بھی جو ٹکڑا ٹکڑا بچوں کے حصے میں آیا اس سے ان کی جان بچی رہی ۔ یہی کیا کم تھا ۔ اس کے بعد انھوں نے کمرے میں ہمیں ایک کھاٹ دی ۔ میں اور بچے مردوں کی طرح اس پر پڑ گئے شیو دیال اور اوم زمین پر سوئے ۔ اتنے میں باہر سے یہ شور سنائی دیا کہ حملہ آور کہیں نزدیک آ پہنچے ہیں ۔ میں نے اٹھ کر شیو دیال سے کہا" بھائی سنو، یہ تلوار سامنے لٹک رہی ہے ۔ جب وہ

لوگ یہاں آئیں گے تو تم فوراً ان سب لڑکیوں کو اس سے قتل کر دینا، بچاری لڑکیاں بھی تیار تھیں ۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ جس کے گھر میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے اس کے پڑوسی اس کے خلاف ہو گئے وہ اس پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ ہمیں اپنے یہاں سے نکال دے ۔ وہ بھلا آدمی تھا ۔ کہنے لگا "بھائی گھر پر آئے ہوئے مہمان کو میں نہیں نکال سکتا ۔ ہمارا مذہب ہمیں یہ نہیں سکھاتا ۔ تم لوگوں نے اس وقت خدا کو بھلا دیا ہے ۔ یاد رکھو خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے" لیکن اس کی کون سنتا تھا ۔ وہ تو اپنی بات پر ڈٹے رہے ۔

کچھ دیر بعد گھر کا مالک کہیں باہر چلا گیا ۔ تب اس کے قریبی رشتے دار نے اس کی بیوی اور بچوں سے کچھ مشورہ کیا اور بندوق لے کر اندر آیا ہم سب کھاٹ سے اتر کر نیچے کھڑے ہو گئے ۔ اس نے بندوق تان کر کہا" یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ابھی فائر کر دوں گا" یہ شخص سرحدی علاقے میں پہلے کہیں فوج میں ملازم رہ چکا تھا ۔ میں نے دل میں سوچا کہ اچھا ہے یہ فائر کر دے، ہم بہادری سے گولیاں کھائیں گے اور اس سے کہا تم فائر کر دو، تو اچھا ہے ۔ میں اس وقت کہاں جاؤں" ہم میں دس قدم بھی چلنے کی ہمت نہ تھی ۔ اس نے ہمیں بہت دھمکایا لیکن ہمارا جواب یہی ملا کہ وہ فائر کر دے ۔ کچھ دیر بعد وہ بولا" اچھا تم اور تمھارے بچے یہاں رہ سکتے ہیں لیکن یہ دو مرد یہاں نہیں رہ سکتے" وہ دونوں بھی جانا چاہتے تھے کیونکہ انکے مارے جانے کا خوف تھا ۔ میں نے ان سے کہا" بھائی جاؤ میرے لئے اپنے آپکو خطرے میں نہ ڈالو بھگوان سب اچھا ہی کرے گا" وہ دونوں، بچوں کو دیکھتے ہوئے اور آنسو بہاتے ہوئے مجبور ہو کر چلے گئے اور ہم سب ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کھاٹ پر بیٹھے رہے ۔ ساتھ لائی ہوئی گیتی اوم اپنے

ساتھ لے گیا۔ سارا دن ہم وہیں پڑے رہے۔ بچوں کو دو دن سے پیٹ بھر کھانا نہ ملا تھا۔ بار بار وہ آہیں بھر رہے تھے۔ اب میں نے بچوں سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ ہمت سے کام لو۔ یہ تمھارے امتحان کا موقع ہے۔ دیکھو میں تمھیں اکثر پرانے زمانے کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ تمھاری پراچین سنسکرتی کا کیا آورش تھا اپنی عزت کی خاطر موت سے کھیلنا۔ بس۔ وہی تمھیں بھی کرنا ہے۔"

گاؤں کے سب لوگ لوٹ کھسوٹ کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔ صرف عورتیں گھروں میں تھیں۔ دن بھر یہی شور مچا رہا کہ اب یہاں پہنچے اب وہاں پہنچے۔ فلاں گاؤں جلایا اور فلاں لوٹا۔ بیچاری عورتیں خوف سے کانپ رہی تھیں اور قبائلیوں کو جی بھر کر کوس رہی تھیں۔ اسی میں رات ہو گئی۔ کوئی سویا نہیں۔ گھر کا مالک کہیں سے تھوڑا سا آٹا لایا اور اپنے واقف ہندوؤں کو تھوڑا تھوڑا دے آیا۔

(۴)

مُنہ بولا بھائی

بارہ بجے تک ہم لوگ بیٹھے رہے۔ بارہ بجے گھر کی مالکن اور اس کا ایک رشتے دار اندر آ کر کہنے لگے "یہاں سے ابھی نکل جائیے۔ ہم تمھیں یہاں نہیں

رکھ سکتے" میں نے کہا "ابھی ابھی تو ہمارے ساتھیوں کو نکال دیا۔ اب رات کے بارہ بجے میں ان بچوں کو لے کر کہاں جاؤں۔ رات بھر رہنے دیجئے۔ صبح ہم چلے جائیں گے۔" وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ مجھے وہ شخص شرارتی نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "ہم تمھیں اس اونچی پہاڑی پر پہنچا دیں گے جہاں گرمی کے دنوں میں ہم مویشی رکھتے ہیں وہاں پتھروں کی گپھا ہے اسمیں تم اور تمھارے بچے رہنا۔ کبھی کبھی ہم لوگ تمھیں یہاں سے کھانا پہنچا دیں گے۔" مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ جانے کن پاپوں کا پھل بھگتنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بھگوان بھی وقت وقت پر اس طرح بچاتا ہے کہ حیرت زدہ رہ جانا پڑتا ہے۔

جب وہ ہمیں بہت ہی تنگ کرنے لگے تو ایک نوجوان وہاں آیا اور میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگا "بہن! میں ایک معمولی آدمی ہوں۔ کیا تم میری ایک بات مانو گی۔ میں تمھیں اپنی بہن سمجھتا ہوں اور مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا اپنے اوپر مصیبت جھیل کر بھی میں تمھاری حفاظت کروں گا۔ میرے دل کی آواز مجھے مجبور کر رہی ہے کہ تمھاری کچھ مدد کروں۔" مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ اچانک میں نے سر کے دوپٹے کا آنچل پھاڑا اور اس کے ہاتھوں میں راکھی باندھی۔ انگلی سے خون نکالا اور اس سے اس کے ماتھے پر تلک لگایا اس نے بھی یہ سب چپ چاپ کرنے دیا۔ مجھے یہ سب کرنے سے ایک عجیب مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا "بھیا۔ یہ ہماری پرانی تہذیب ہے۔ ہمایوں کے وقت میں بھی یہ رسم ہوئی تھی اور بھائی کو بہن کا قول نبھانا پڑا تھا۔ میں بھی تمھیں اپنا بھائی سمجھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ تم اس اقرار کو نبھاؤ گے۔"

کچھ دیر بعد اس نے ان گھر والوں سے کہا "رات بھر انہیں یہاں رہنے دیجئے صبح میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں گا" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہم سوتے رہے۔

صبح جب میں اٹھی تو میرا دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر رونا آتا تھا دل میں خواہ مخواہ یہ خیال آ رہا تھا کہ ان کی (رہتا جی) کی جان سلامت نہیں ہے لیکن دوسرے ہی لمحے دل میں خیال آیا "یہ آنسو بچوں کے لئے بہت برے ثابت ہوں گے ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر وہ بہادری سے مصیبتوں کا سامنا نہ کر سکیں گے"۔ یہ سوچ کر میں نے رونا بند کر دیا اور جا کر بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔

گھر کا مالک اور مالکن کہیں باہر چلے گئے تھے اور ان کے پیچھے ان کے بارہ سالہ لڑکے نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ اس نے کہا "یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم تمھیں یہاں نہیں رہنے دیں گے"۔ ہمیں نکلنا پڑا۔ وہ وقت بڑا بھیانک تھا میں نے سنا کہ اس گاؤں کی ہندو عورتوں اور لڑکیوں نے ایک مکان میں آگ جلائی اور صاف کپڑے پہن کر منتر پڑھتی ہوئی اس میں کود پڑیں اس طرح انھوں نے ہنستے ہنستے جوہر کی رسم کو دہرا دیا۔ کہتے ہیں کہ بعد میں حملہ آوروں نے جلتی ہوئی لاشیں کھینچ کر باہر نکالیں اور ان کے جسم سے زیور اتارے۔ جس وقت پاس کے گاؤں میں یہ سب ہو رہا تھا اسی وقت انھوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ میں نے بچوں کو آگے چلنے کے لئے کہا اور خود اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ کہاں جاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن چلنا تھا

اس لئے سیدھے ہی چل پڑی۔ کچھ دور چل کر ایک پہاڑی پر چلنا پڑا راستے میں ایک چٹان کی آڑ میں ایک گپھا نظر آیا۔ بچوں کو میں نے اس کے اندر بٹھایا۔ خود سامنے بیٹھ گئی۔

بچوں کو گپھا میں اس لئے بٹھایا کہ آنے جانے والوں کو لڑکیوں کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ ہم وہاں تقریباً ڈھائی گھنٹے ٹھہرے۔ آس پاس سے گولیوں کی آواز آ رہی تھی لیکن ہمیں کوئی نہیں لگی۔ کچھ دیر بعد رات والا میرا منہ بولا بھائی مجھے کھوجتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی بچے خوش ہو گئے اور کہنے لگے "دیکھو ماں تمہارا بھائی آ گیا" اس نے پاس آتے ہی جلدی چلنے کو کہا۔ ہم سب اس کے ساتھ ہو لئے جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا "صبح میں دو میل حملہ آوروں سے پوچھنے گیا تھا کہ کچھ عورتوں کو اپنے یہاں رکھوں یا نہیں! انہوں نے رکھنے کی اجازت دیدی ہے۔ اب میں کھلے طور پر تمہاری مدد کر سکوں گا۔ لیکن نہ جانے کب کونسی پارٹی یہاں آ جائے اور پوچھے کہ یہ کون ہیں تو اس وقت کیا کہوں گا۔ کیوں کہ تمہاری شکل صورت ہم سے نہیں ملتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب وہ پوچھیں کہ یہ کون ہے تو میں کہوں گا میری بہن ہے اور اس کی شادی سیالکوٹ میں ہوتی ہے۔ کیا یہ تجویز تمھیں پسند ہے؟ اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ لڑکیوں کو بچانے کے لئے تمھیں یہ سب کرنا ہوگا۔ تم فکر نہ کرو خدا پر یقین رکھو سب ٹھیک ہو گا"۔

یہ سنتے ہوئے میرا رواں رواں اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ وہ بھی تو مسلمان تھا۔ اس نے فوراً ہمیں دودھ اور روٹی لا کر دی۔ اس کے خاندان

میں کل سات افراد تھے۔ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ سوتیلی ماں اور باپ ایک شادی شدہ بہن اور ایک چھوٹا بھائی۔ ایک برامدے اور دو کمروں کا اس کا مکان تھا۔ جس میں اس کے مویشی بھی ساتھ ہی بندھے رہتے تھے۔ اس کی مالی حالت قابلِ رحم تھی لیکن دل دریا تھا۔

ہمارے لئے اس نے مویشیوں والے کمرے میں ایک کھاٹ بچھادی چارپائی کے نیچے گوبر پر ایک چٹائی ڈالدی۔ ہم لوگوں کو اسی چٹائی پر لیٹنا پڑا۔ وہاں گوبر کی اتنی بدبو تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسری طرف دل میں خوف تھا کہ نہ جانے اب کیا سلوک ہو؟ پیاس بے حد لگ رہی تھی گھڑی گھڑی گلہ سوکھتا تھا۔ سانس زور سے لینے تک کی ممانعت تھی۔ ادھر بچوں کو پانی پینے کے باعث پیشاب زیادہ آتا تھا۔ وہاں پیشاب گھر تو تھا نہیں اس لئے انھیں بار بار باہر جانا پڑتا تھا۔ ڈر تھا کہ کوئی گاؤں والا دیکھ نہ لے۔

حملہ آور مقامی مسلمانوں میں یہ پرچار کر رہے تھے۔ مسلمانوں تمھیں تیار رہنا چاہیے۔ سکھ تم پر حملہ کریں گے" بس پھر کیا تھا۔ گاؤں کے سبھی مرد لاٹھیاں بھالے فرسے، برچھے اور بندوقیں لے کر گھروں کے باہر گھوم رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب کے سب راکشش کھڑے ہوئے ہیں۔ انسانیت ان میں نام کو نہ رہی تھی۔

اس طرح یہ دن بھی گذر گیا۔ تھوڑا اندھیرا ہوا تو انھوں نے ہمیں اس قید خانے سے نکالا۔ ہم باہر برامدے میں بیٹھ گئے۔ اس کی بہن باپ کے یہاں نہ آنے پر رونے لگی۔ میں نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "بیٹی، رونے سے کیا ہوگا اٹھو کر روٹی بناؤ" یہ ہمارے غربت کے دنوں میں اتنے

جکڑے ہوئے تھے کہ اس وقت ان کے پاس کھانے کا سامان تک نہ تھا۔ فصل تیار تھی لیکن وہ سب کھیتوں میں بنا کٹے پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت آٹا کہاں سے آئے، یہ مسئلہ درپیش تھا۔ بڑی مشکل سے کہیں سے وہ بھائی تھوڑا سا آٹا، چاول اور کاشی پھل لایا۔ کاشی پھل کا ایک حصہ میں نے چولھے کی راکھ میں بھوننے کو رکھدیا۔ ان کے بچے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بہت کمزور تھے۔ بھوک کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے وہ بھٹے بھون بھون کر کھاتے تھے۔

اور لوگ لوٹ مار میں مصروف تھے لیکن میرا بھائی ان باتوں سے نفرت کرتا تھا وہ سچ مچ ایک اونچے خیالات کا انسان تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے بچوں سے کہا "دیکھو بنا کام کئے کچھ کھانا پاپ ہے۔ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیے۔ یہ سن کر سرلش اور وینا دونوں لڑکیاں اس کی بہن کے ساتھ چکی میں آٹا پیسنے گئیں۔ باقی لڑکوں نے ہاتھوں سے مکئی کے بھٹے چھیلنے شروع کئے۔ میں نے شالی (دھان) کے کچھ بال لئے اور اس کی بیوی سے ان میں سے چاول نکالنے کا طریقہ پوچھا۔ اس نے بتایا "آپ انہیں پیروں تلے مسلیں تو کچھ چاول نکل آئیں گے" وہ خود بھینسوں کو چارہ بھوسا دینے چلی گئی۔ ننگے پاؤں ہم نے کافی سفر کیا تھا۔ نہ جانے اس وجہ سے یا کام کرنے کا طریقہ نہ آنے کے باعث میرے دونوں پاؤں سے خون بہنے لگا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ سوچا، ہم نے اپنے آپ کو کتنا آرام پسند بنالیا ہے۔ میں کچھ بھی کام نہیں کر سکتی۔ بچوں کو کیسے رکھوں گی؟ کیسے گزر بسر کروں گی؟ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اتنے میں گھر کی مالکن آئی اُسے میرے زخمی پیروں کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے کہا "بہن!

چھوڑ دو۔ میں تمھارا یہ حال نہیں دیکھ سکتی۔ جب تک ہم ہیں تمھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ میں سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اور آنے والے سفر کے دنوں کا خیال کرنے لگی۔ اتنے میں دونوں بچیاں چکی سے آٹا پیس لائیں دونوں مسکرا رہی تھیں میری نظر ان کے ہاتھوں پر پڑی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ دونوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں خاموش ہو گئی۔ کیا کہتی۔ کچھ کہتے نہیں بنا۔

کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے بھی کھایا لیکن اتنا کم کہ نہ کھانے کے برابر تھا۔ میں نے بھی جو راکھ میں کاشی پھل بھونا تھا، وہ کھایا۔ ان کے بچوں کو بھی پوری خوراک نہیں ملی۔ لیکن وہ خوش تھے۔ ان غریب کسانوں میں کتنی قوت برداشت ہوتی ہے۔

انھوں نے ہمیں ایک کھاٹ دی۔ ہم سب مویشیوں والے کمرے میں لیٹ گئے ساری رات لوگوں میں بڑی بے چینی رہی۔ کچھ گھنٹے کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے ہم اپنی موجودہ حالت پر غور کرتے رہے۔ رہ رہ کر بچے پتاجی کی بات کرتے تھے۔ میں انہیں ان باتوں کا کیا جواب دیتی۔ تھوڑی دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی میرے سرہانے کے ساتھ ہی ایک گائے بندھی تھی۔ اس نے سوتے میں ہی میرے سر کے بال چاٹنے اور چبانے شروع کر دئے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ بالوں میں بڑے زور سے درد ہو رہا تھا

صبح ہوئی۔ ہم اٹھے۔ بچوں کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ کھانے کو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ بچے مکئی کے بھٹوں کے دانے نکالنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں چھالے پہلے ہی پڑے ہوئے تھے اب چھوٹے بچے کے ہاتھ سے بھی خون بہنے لگا۔ وہ کپڑے سے خون کو پونچھتا جاتا تھا۔ میری نظر اس کے ننھے ہاتھوں پر جا پڑی تو میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانا اور برابر دانے نکالتا رہا۔ میں نے اٹھ کر اسے پیار سے سمجھایا، وہ کہنے لگا "ماں تم ہی نے تو کہا تھا کہ کام کئے بنا کھانا پاپ ہے۔ اب مجھے کیوں روکتی ہو"۔ میں نے کہا "بیٹا دیکھو تمھارے ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے یہ مکئی کے دانے بھی لال ہو رہے ہیں" وہ کہنے لگا "ممی کیا ہاتھ بھی ہمیں کام نہیں کرنے دیتے"۔ اتنے میں گھر کی مالکن آئی اور بچے کو دیکھ کر کہنے لگی "تم ماں کا دل نہیں رکھتی ہو، بہن! دیکھو ان سب بچوں کے ہاتھوں میں کتنے چھالے پڑ گئے ہیں" یہ کہہ کر اس نے بچوں کو کام کرنے سے روکا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک عورت آئی اور کہنے لگی "نہ جانے تمھارے خاوند ہیں یا نہیں۔ اب تمھارا کیا ہوگا۔ چلو اب ان بچوں کو مانگنے کے لئے بھیج دیا کرو کوئی رحم کھا کر کچھ دے ہی دیا کرے گا۔ تمھارا کام چل جائے گا۔ تم کہیں بیٹھ جاؤ تو اچھا ہے۔ بچے بھی بچ جائیں گے"۔ بیٹھ جانے کا مطلب میں سمجھتی تھی میں ایک دم لرز اٹھی لیکن خاموش رہی۔ اس سیدھی سادی عورت کو کیا معلوم کہ خود اعتمادی کے آگے بڑی سے بڑی قربانی کی بھی کچھ قیمت نہیں۔ وہ تو صرف پیٹ پالنا جانتی تھی چاہے جس طرح بھی پلے، اتنے میں میرا بھائی باہر سے آیا۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ دونوں کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ اس کا باپ کہنے لگا "پڑوس کے کچھ آدمیوں نے تم لوگوں کو یہاں دیکھ لیا ہے اور قبائلیوں سے جا کر کہا ہے کہ ان کے یہاں کچھ ہندو عورتیں ہیں۔ بڑا غضب ہوا۔ اب لڑکیوں کا کیا ہوگا! بہن سنو۔ اگر تم برا نہ مانو تو ان لڑکیوں کے بچاؤ کی ایک ترکیب

ہے کہ جب وہ آئیں تو یہ کلمہ پڑھ دیں اور کہیں کہ ہم مسلمان ہیں"۔ بچوں نے کہیں اسکول میں پڑھ سن کر کلمہ سیکھا لیا تھا۔ کہنے لگے "بھلا کلمہ پڑھنے سے کوئی مسلمان بنتا ہے؟" میں نے بھائی سے کہا "جھوٹ کبھی چھپتا نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں کلمہ پڑھنا نہیں چاہتی۔ سکھاؤ مجھے۔ میں پڑھتی ہوں۔ لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میرے منہ سے اس وقت ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔ چاہے تم کتنا ہی رٹاؤ۔ تم گھبراؤ نہیں۔ بھگوان سب ٹھیک کریں گے" وہ کہنے لگا "آج وہ گھر گھر میں چھپی ہوئی ہندو عورتوں کو نکال کر بری طرح لے جا رہے ہیں۔ نہ جانے خدا اب کیا کرنا چاہتا ہے"۔

کھانا چولھے پر دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ڈر کے مارے بھوک مر گئی۔ ان لوگوں کو اپنی بھی بہت فکر تھی کیوں کہ قبائلی ہندو عورتوں کو ڈھونڈنے کے بہانے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر انہیں بھی لوٹتے تھے۔ کہیں کہیں تو ان کی عورتوں کی بھی بے عزتی کیا کرتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے چار بج گئے۔ تبھی دو ہٹے کٹے مسلمان ہاتھوں میں بندوقیں لئے وہاں آ پہنچے۔ ان میں ایک اس کا نمبردار تھا دوسرا اکثر ہمارے گھر شہر میں دودھ دینے آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے پہچانا لیکن میں کچھ بولی نہیں۔ انھوں نے آتے ہی گرج کر کہا "نکالو انہیں یہاں سے۔ قبائلی تم لوگوں کو بلا رہے ہیں"۔ ہم سب گھر سے نکلے۔ وہ ساتھ آئے راستے میں جلدی جلدی چلنے کی ڈانٹ بھی بتلا رہے تھے۔ میں نے دونوں لڑکوں سے کہا "بیٹو! مجھے تمہاری فکر نہیں۔ صرف ایک بات سمجھاتی ہوں۔ سنو موت سے مت ڈرنا۔ وہ ہماری دوست ہے۔ اگر تم پر کوئی فائر کردے تو چھاتی آگے

کر دینا۔ بھاگ کر پیٹھ پر گولی مت کھانا" دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "ہم موت سے نہیں ڈرتے" پھر میں نے بڑی لڑکیوں سے کہا "بیٹیو! وقت نے ہمیں سب کچھ دکھا دیا۔ ابھی نہ جانے اور کیا ہوگا۔ تمھیں سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیئے۔ بھارت کی بہادر لڑکیاں وقت پڑنے پر موت سے کھیلتی ہیں، یہ بات دھیان میں رکھنا"۔

کچھ دور چل کر وہ ہمیں ایک جگہ پر لے گئے۔ وہاں پہلے سے ہی کتنی ہندو اور سکھ مرد عورتیں بیٹھی تھیں۔ سامنے دو قبائلی کھڑے تھے۔ کارتوسوں کا ہار پہنے، بندوقیں لئے وہ وہاں پہرا دے رہے تھے۔ ہمیں بھی اس ٹولی میں بٹھایا گیا، اتنے میں اور قبائلی آئے۔ ان کی شکلیں بڑی بھیانک تھیں۔ انھوں نے کچھ دیر تک آپس میں باتیں کیں اور پھر مقامی مسلمانوں سے بولے، "دیکھو، انہیں رات بھر یہیں رکھو اور ایک بچھڑا مارو اور ان کافروں کو کھلاؤ تاکہ یہ سب مسلمان بن جائیں" یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں بھگوان کا نام لینے لگی "بھگوان! ہماری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے تم پر یقین ہے۔ تم ہی آخر تک بچانے والے ہو"۔

کچھ دیر بعد میرا بھائی آیا اور کہنے لگا "بہن! تم فکر نہ کرو۔ جب تک میں ہوں مجھے تمہاری فکر ہے"۔ میں نے اُسے اپنے وہ گہنے دے دئے جو میں نے گھر سے نکلتے وقت بدن سے اتار کر رکھ لئے تھے اس نے انہیں لیتے ہوئے کہا "یہ تمھاری امانت ہے بہن! جب چاہو لے لینا"۔ ہم بات کر ہی رہے تھے کہ وہ شخص جو نمبردار کے ساتھ ابھی ہمارے پاس آیا تھا کہنے لگا "آپ نے مجھے پہچانا؟ میں آپ کے یہاں دودھ بیچنے آیا کرتا تھا۔ تب آپ ہم لوگوں کے سامنے

باہر نہ آئی تھیں" میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں گھر سے کچھ بھی ساتھ نہیں لائی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیں تمہارے کچھ روپے دینے ہیں۔ یہ تمہارا قرض ہم پر رہے گا" وہ کہنے لگا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔ ہمیں قبائلیوں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ مجھے معاف کرنا!"

(۵)

اسلام کی تعلیم

کچھ دیر بعد وہ دونوں قبائلی نوجوان آئے اور کہنے لگے "انہیں ہم آج دو میل لے جائیں گے اس لئے بچھڑ نہ مارو" اور پھر ایک ایک مرد عورت کی بری طرح تلاشی ہونے لگی۔ جس کے پاس پیسہ سونا جو کچھ بھی تھا اسے وہ چھین رہے تھے۔ لوگ گھروں سے بھاگتے وقت کافی چیزیں ساتھ لے آئے تھے کئی عورتوں نے قمیضوں کے بارڈروں اور شلواروں میں نوٹ سی رکھے تھے۔ کئی ایک نے کمر سے زیور باندھ رکھے تھے۔ جن کی کمر سے زیور بندھے ہوئے ملے ان کی سختی سے تلاشی لی گئی۔ جن کی قمیضوں میں چھپی ہوئی دولت ملی ان کی قمیضیں اتروائی گئیں۔

میری بھی باری آئی۔ جب ایک قبائلی نے میری کلائی پکڑی تو میرے

منہ سے رام نکلا۔ اس نے جھٹکا دے کر میری کلائی چھوڑ دی اور کہا "تم اس جھوٹے مذہب کو چھوڑ دو۔ سچا مذہب اسلام ہے۔ جاؤ اس طرف کھڑی ہو جاؤ" پھر وہ بچوں کی تلاشی لینے لگے۔ ایک نے بچی کی جیبیں دیکھیں۔ جب کچھ نہ ملا تو سب کو میرے پاس کھڑا کر دیا۔ اتنے میں میرا بھائی وہاں آیا۔ اس نے قبائلیوں سے کہا "خان، انہیں میں گھر لے جاؤں گا۔ اجازت ہے" انھوں نے کہا "لے جاؤ" لیکن ساتھ ہی ایک نے جب میری دو بڑی لڑکیوں کو دیکھا تو کہا "سب کو نہیں جانا ہوگا" میں رک گئی۔ بھائی آنکھوں میں آنسو لئے چلا گیا۔

تلاشی جاری تھی۔ جنھوں نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کے کپڑے ہی اتار لئے جاتے تھے۔ بچوں کے گرم کوٹ، مردوں کے پل اوور، عورتوں کے شال جو چیز ملتی لے کر رکھ لیتے۔ انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کسی کے تن پر کپڑا رہا ہے یا نہیں۔ بھگوان نے ہمیں پہلے ہی سمجھ دی تھی۔ ہم گھر سے کچھ بھی ساتھ لے کر نہ چلے تھے۔ اتفاق سے ہم نے کپڑے بھی ایسے پہن رکھے تھے۔ جنھیں دیکھ کر کوئی یہ نہ جان سکتا تھا کہ ہم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تلاشی ختم ہوئی تو سب کو چلنے کا حکم ملا۔ سب چل پڑے۔ آگے آگے وہ خود چلے اور پیچھے میری دونوں بڑی لڑکیوں کو چلنے کے لئے کہا۔ مجھے ان کی نیت پر شک ہوا۔ میں نے آہستہ سے لڑکیوں سے کہا "دیکھو موت سے کبھی نہ ڈرنا۔ جب وقت ملے ندی میں یا پہاڑ سے کود کر جان دے دینا لیکن جیتے جی اپنے خاندان پر آنچ نہ آنے دینا۔ تم اس بھارت کی سنتان ہو جہاں عورتیں زندہ ستی ہو جاتی

تھیں، "میری بڑی لڑکی وینا بولی "ماتاجی، تم فکر مت کرو صرف ہمارے ان ننھے بھائیوں کا دھیان رکھو۔ ہمیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے دل اور دماغ سے کام لینے دو۔ جو اپنے دل اور دماغ سے کام نہیں لیتا دوسرا اسے کب تک راستہ دکھا سکتا ہے؟" اس چودہ سال کی بچی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے حیرت ہوئی اور کچھ اطمینان بھی۔ ایک قبائلی نے ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ڈانٹا اور لڑکیوں کو اپنے قریب پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ میں انہیں تنہا آگے نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ ادھر بچوں سے تیز چلا نہیں جا رہا تھا۔ صبح سے وہ بھوکے بھی تھے لیکن لڑکیوں کے ساتھ رہنے کے لئے میں انھیں گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ ان کے چہرے مرجھا رہے تھے۔ موت سامنے کھڑی تھی۔ ذرا پاؤں پھسل جائے تو دھم سے ندی میں گرنے کا اندیشہ تھا۔ دوسری طرف اگر کسی سے چلا نہ جائے تو اس بھیانک جنگل میں تنہا رہ جانے کا خوف تھا۔ اس وقت سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ نہ ماں بچے کی مدد کر سکتی تھی اور نہ خاوند بیوی کی سدھ لے سکتا تھا۔

میں نے پھر قبائلیوں کے پاس جا کر باتیں کرنی شروع کیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا اور وہ سب کو تیز تیز چلنے کے لئے ڈانٹ رہے تھے۔ ٹولی میں کئی عورتیں حاملہ تھیں۔ مارے خوف کے انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے قبائلیوں سے کہا "میں نے سنا ہے کہ پٹھان قوم بہادر اور وعدے کی پکی ہوتی ہے اور بہادر قوم عورتوں اور معصوم بچوں پر ظلم نہیں کیا کرتی۔ لیکن تم ان معصوم بچوں کو ڈانٹ رہے ہو۔ کیا تم نے خدا کو بھلا دیا ہے؟ کیا تمہارا اسلام تمھیں یہی سکھاتا

ہے؟ وقت کا کچھ علم نہیں۔ ابھی دو دن پہلے میرا شوہر یہاں کا وزیر تھا۔ اب نہ جانے وہ کہاں ہے؟ میں اور یہ بچے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس زندگی سے اپنی عزت اور عصمت بہت پیاری ہے جہاں تک ہو گا ہم اس کی حفاظت کریں گے مگر تم میری ایک بات مان لو تو میں تمہارا احسان مانوں گی وہ یہ کہ تم مجھے اپنے سردار کے پاس لے چلو" یہ دونوں ہندوستانی سمجھتے تھے۔ میری باتیں سن کر کہنے لگے "واقعی ہمارا اسلام یہ نہیں بتاتا لیکن ہم کیا کریں۔ ہمیں حکم ہی ایسا ہے" ان کا دل اب کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔ وہ اب ہم سب کو آہستہ آہستہ چلنے دینے لگے۔ کچھ دیر بعد پھر بولے "ہم کتنی دور سے یہاں لڑنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اپنے خاندان وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ ہمارے بھی ماں باپ، بھائی بہن ہیں۔ ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی ہے" میں نے کہا "تم خاندان والے ہو۔ سب کا دکھ درد جانتے ہو اور ہو بھی ذات کے بہادر پٹھان۔ تم سے تو ہم نیکی ہی کی امید رکھتے ہیں" یہ سن کر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

میری بڑی لڑکی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں ذرا پیچھے رہ گئی کیوں کہ میرا بڑا لڑکا تھک گیا تھا۔ میں نہ اسے چھوڑ سکتی تھی اور نہ لڑکی کو۔ لیکن لڑکی پر مجھے بھروسہ تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ لڑکی اور ایک قبائلی نوجوان لوٹ کر میرے پاس آئے۔ نوجوان کہنے لگا "جہاں آج رات ہم آپ لوگوں کو لے جا رہے ہیں وہاں بڑے ظلم ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تیری اور تیرے ان بچوں کی حفاظت کریں گے۔ تو ہماری ماں ہے اور یہ لڑکیاں ہماری بہنیں ہیں" میں حیران تھی کہ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟ لڑکی نے اس سے کیا کہا جو وہ راکشش سے دیوتا بن گئے اب وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ اور ہم سب کو بھی آہستہ آہستہ چلنے کو کہہ رہے تھے ان میں انسانیت جاگ اٹھی

تھی۔ شاید انہیں اسلام کی تعلیم یاد آرہی تھی۔

دس بجے ہم دو میل پہنچے۔ وہاں ریاست کشمیر کے ایک جانوروں کا ہسپتال تھا جو جلنے سے بچ گیا تھا۔ یہ کرشن گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ اس مکان کے کمرے خاصے بڑے بڑے تھے۔ انہیں میں سے ایک میں ہم رکھے گئے۔ وہاں تین دن سے اور بھی ہندو بچے اور عورتیں رکھی گئیں تھیں۔ کمرے میں اتنا اندھیرا اور اتنی بھیڑ تھی کہ دم گھٹتا تھا۔ جیسے ہی ہماری ٹولی کمرے میں آئی ویسے ہی وحشی قبائلی اور ڈوگرہ رجمنٹ کے کچھ باغی مسلمان فوجی طوفان کی طرح اندر آتے اور عورتوں اور لڑکیوں کو ٹارچوں سے دیکھ دیکھ کر لے جانے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کہرام مچ گیا۔ عورتیں اور لڑکیاں ان کے ساتھ جانے سے انکار کر رہی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ لیکن پاکستان کے بھیجے ہوئے مجاہد کب ترس کھانے والے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جہنم اگر کہیں ہے تو یہیں ہے۔ لیکن اسی جہنم کے بیچ میں وہ دونوں نوجوان ہمیں ایک کونے میں ٹھہرا کر خود ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے قریب ہی باہر جانے کا ایک دروازہ تھا۔ میں اور بچے یہ ظلم دیکھ کر لرز اٹھے تھے۔ میں پھر بھی بچوں سے کہہ رہی تھی "رام کا نام لو وہی حفاظت کریں گے"، نوجوان قبائلی کہنے لگا "گھبراؤ مت۔ ہم تمہاری حفاظت کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ جہاں تک بن پڑے گا ہم اسے پورا کریں گے۔"

اور انہوں نے اس طرف کسی کو نہیں آنے دیا۔ وہاں بہت شور مچ گیا تھا۔ اسے سن کر باہر سے ان کا ایک افسر آیا۔ اس نے کہا "تھوڑی دیر کے لئے سب کو چھوڑ دو" لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کچھ عورتوں اور لڑکیوں کو لے گئے تو ان دو نوجوان

پہرے داروں کے علاوہ ان کا کوئی آدمی وہاں نہیں رہا۔ تب انہوں نے ہمیں دروازے کے پاس بٹھایا اور خود بندوقیں لے کر دروازے میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت پاس کے کمرے سے لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ یہاں تین دن سے لوگ بغیر روٹی اور پانی کے بند تھے۔ ان میں کتنی شخص اپنی آخری گھڑیاں گن رہے تھے لیکن وہاں کون سنتا؟ میں یہ دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی۔ میں نے اپنے پہرے داروں سے کہا "بھائی ان بے بس لوگوں کو پانی دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔" سچ مچ وہ دیوتا بن گئے تھے۔ اور باری باری گھڑوں میں پانی لاکر انہیں دے آئے۔ اندھیرے میں کسے ملا اور کسے نہیں یہ معلوم نہیں لیکن پھر بھی کچھ لوگوں کی جانیں ضرور بچ گئیں۔ باقی انسانیت کی دہائی دیتے ہوئے اس دنیا سے اٹھ گئے۔

ان گنت عورتیں کونوں میں دبکی پڑی تھیں۔ ان کے بچے رو رہے تھے ان میں سے کئی ایک نے تو اپنی عصمت کی حفاظت کے لئے اپنے بچوں تک کا گلہ گھونٹ دیا تھا۔ کئی عورتیں پاخانے کے بہانے باہر گئیں اور کرشن گنگا کی گود میں سو گئیں۔ ان گنت ماؤں نے اپنے زندہ بچے اس ندی کی بھینٹ کر دئے۔

یہ خبریں قبائلی سرداروں کے پاس پہنچیں۔ انہیں عورتوں کا اس طرح مرنا منظور نہ تھا وہ انہیں گھل گھل کر مرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ پہرا کڑا کر دیا گیا ایک اور پارٹی آئی وہ سب مردوں کو پکڑ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہ نہتے مرد یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ ہمیں مارنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ آخری جدائی کا وہ منظر بڑا دردناک تھا۔ بچے ان سے لپٹ لپٹ جاتے تھے لیکن وہاں رحم کھانے والا کون تھا؟

میرے پاس دو تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک ماں بیٹی تھی۔ بیٹی حاملہ تھی اور اُس وقت دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ وہ لوگ اس کے خاوند کو بھی لے گئے۔ جب سب چلے گئے تو ان دو نوجوانوں نے دروازے کے باہر میری دو لڑکیوں کو سلا کر ان پر کمبل ڈال دیا۔ جو بھی وہاں سے گذرتا اور پوچھتا "یہ کیا ہے" تو وہ دونوں جواب دیتے "کچھ نہیں، سپاہی سو رہے ہیں"۔ میں نے ان سے پوچھا "تم کھانا نہیں کھاؤ گے" کہنے لگے "ہمیں کئی کئی دن ایسے ہی بتانے پڑتے ہیں اور اگر ہم یہاں سے چلے بھی جائیں تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

اتنے میں بھرتی قبائلی میرپوری اور جموں کے باشندے مسلمان باغی فوجیوں کے ساتھ ٹارچ ہاتھ میں لئے وہاں آئے۔ وہ بھی ٹارچوں سے دیکھ کر عورتوں کو لے جانے لگے۔ پھر آہ و بکا ہونے لگی۔ قبائلیوں سے زیادہ بے رحم وہ باغی فوجی تھے۔ انہوں نے عورتوں کی گود سے بچے چھین چھین کر نیچے پٹک دئے اور خود ان کی ماؤں کو گھسیٹ کر لے گئے۔ جو عورت احتجاج کرتی تھی اور کہتی تھی "مجھے جان سے مار ڈالو لے مت جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی اسے کئی آدمی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ جس طرف ہم بیٹھے ہوئے تھے کئی بار انہوں نے اس طرف آنے کی بھی کوشش کی لیکن ہر بار ان دو بہادر پٹھانوں نے بندوقوں کے کندوں سے انہیں مارا اور ڈانٹ کر کہا "اگر تم لوگوں نے اس طرف آنکھ اٹھائی تو تباہ ہو جاؤ گے۔"

میں اپنے دل میں سوچنے لگی۔ کب تک یہ لوگ انہیں روکے رہیں گے مجھے بھی بچوں کو لے کر کرشن گنگا کی گود میں سما جانا چاہیئے لیکن پھر سوچا "اگر میرے بعد ایک بھی بچہ زندہ رہا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ میرے شوہر کتنے دکھی ہوں گے!" ساتھ

ہی یہ خیال بھی دل میں آتا تھا کہ جب تک بھگوان ہماری حفاظت کریں گے تب تک میں خودکشی نہ کروں گی اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں کچھ کر کے مرنا چاہتی ہوں جس موت کا کوئی مقصد نہیں۔ اس سے مجھے نفرت تھی۔

نصف رات کے بعد کچھ سکون ہوا۔ تب ان دونوں نوجوانوں نے کہا "اب ہم اپنی جگہ اپنے ہی دوسرے دوستوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان لڑکیوں کو تم سے کہیں الگ رکھیں۔ صبح ہوتے ہوتے اگر ان پر کسی کی نظر پڑ گئی تو غضب ہو جائے گا۔ تمہیں اعتبار ہو تو ہم انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور جب تم کسی ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گی تب ہم انھیں تمھارے پاس پہنچا دیں گے۔ تم فکر مت کرو۔ خدا تمھاری مدد کرے گا!" یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور اپنی جگہ دو بوڑھے پٹھانوں کو چھوڑ گئے۔ انہوں نے آتے ہی بچوں کو اپنے پاس سے سیب، اخروٹ اور خوبانیاں دیں۔ بچے بھوکے تھے کھانے لگے۔ میں نے ان نئے پہرے داروں سے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں کے ضلع افسروں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ میرا شوہر انہیں میں سے تھا۔ وہ یہاں کا وزیر تھا" ان میں سے ایک بولا "اس کی تو ہمیں پہچان نہیں لیکن ہمیں سب سے پہلے افسروں کو ختم کرنے کا حکم تھا۔ ہم نے آتے ہی سب کو مار ڈالا" یہ سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ وہ پھر کہنے لگا "نہ جانے کیوں میرا دل مجھے تمھاری اور تمھارے ان بچوں کی مدد کرنے پر مجبور کر رہا ہے" میں نے کسی طرح سنبھل کر کہا "خدا کو یاد کرو۔ اس وقت یہاں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ کون جانتا ہے کہ ہماری مدد کے لئے خدا نے تمھاری شکل میں فرشتوں کو بھیجا ہو" یہ سن کر وہ کلمہ پڑھنے لگے۔ مجھ سے کہا "تم بھی پڑھو" میں نے کہا "مجھے نہیں

آتا" وہ مجھے سکھانے لگے۔

تبھی باہر سے ایک اور گروہ آیا۔ کمرے میں پھر رونا چیخنا شروع ہوا جس طرف دروازے کے پاس ہم بیٹھے تھے۔ اس طرف بھی دو لٹیرے آتے اور پوچھنے لگے "یہاں کون ہے؟" تب ان دونوں پٹھانوں نے چلّا کر کہا "یہاں مت آنا تباہ ہو جاؤ گے" وہ لوگ دوسرے راستے سے اندر آ کر عورتوں کو لے جانے لگے۔ میرے پاس تین عورتیں اور تھیں۔ وہ بھی ان نیک پٹھانوں کے رحم سے بچی رہیں۔ کچھ دیر بعد ان نیک پٹھانوں نے مجھ سے کہا "کیا تم ہمارے ملک آنا پسند کرو گی؟ ہم تمھیں وہاں ایک زیارت پر رکھیں گے دیکھو اس مصیبت کے وقت میں خدا تمھاری کتنی مدد کر رہا ہے"

میں نے کہا "میں اپنا وطن چھوڑ کر تمھارے ملک میں کیسے جا سکتی ہوں! میرا شوہر ہے۔ یہ بچے ہیں۔ ابھی میری عمر زیارت پر بیٹھنے کی نہیں ہے"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کمرے میں پھر سسکنے اور کراہنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دیکھا کچھ نوجوان لڑکیاں باہر جا رہی ہیں اور بچھڑتے وقت دوسری عورتوں سے معافی مانگ رہی ہیں "ہمارے قصور معاف کر دینا! نہ جانے کن پاپوں کا پھل اب ہمیں مل رہا ہے۔ اب ہم جینا نہیں چاہتے"

یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ آخر یہ کیا کرنے جا رہی ہیں لیکن اس وقت کچھ پوچھنے کا وقت تھا نہ کچھ کرنے کا۔ میں صبح ہونے کا راستہ دیکھنے لگی۔

(۶)

کرشن گنگا کی گود میں

پو پھٹی۔ وہ دونوں نوجوان اپنے کہنے کے مطابق میری دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے گئے۔ مجھے اپنی لڑکیوں پر تو پورا بھروسہ تھا لیکن ان بہادر نوجوانوں پر بھی کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر بچایا تھا۔ ساتھ کی عورتیں مجھ سے کہنے لگیں "کیا تمھیں ان پر بھروسہ ہے؟" یہ سن کر میں حیران رہ گئی۔ رات بھر انہوں نے ان کی حفاظت کی تھی۔ وہ چاہتے تو بلا روک ٹوک انہیں اٹھا کر لے جاتے لیکن بھگوان نے ان کی عقل کو بدل دیا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا "ان پر مجھے کسی طرح کا شک نہیں ہے اور اپنی لڑکیوں پر مجھے پورا بھروسہ ہے وقت پڑنے پر وہ جان پر کھیلنا جانتی ہیں"

پوری روشنی ہو جانے پر باقی اور سب عورتوں کو باہر نکالا گیا۔ وہ سب دومیل پل کے پاس کرشن گنگا کے کنارے ضروری حاجتوں کے لئے لے جائی گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ میں نے وہاں ایک ایسا عجیب و غریب منظر دیکھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ کچھ عورتیں کنارے پر کھڑی تھیں اور کچھ پانی کے بیچ چٹانوں پر۔ ان میں سے ان گنت مائیں اپنے بچوں کو ندی میں پھینک رہی تھیں۔ کچھ بچے تو بس ایک

آدھ ڈبکی کھا کر بہہ جاتے تھے لیکن کچھ کنارے کے پاس ہی اپنی ماؤں سے چمٹ جاتے تھے اور وہ مائیں اپنے ہی دل کے ان ٹکڑوں کو پھر پانی میں پھینک دیتی تھیں اس وقت ان دیویوں کے چہرے بہت بھیانک ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھیں سوج گئیں تھیں اور ان کے چہرے مردوں کی طرح جذبات سے عاری، خون سے عاری اور حرکت سے عاری ہو رہے تھے۔

انہوں نے اسی پر بس نہیں کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے خود بھی ندی کے تیز بھاؤ میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر کنارے پر کھڑے قبائلی دوڑے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکیں چٹانوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں زور سے چیخیں اور دھڑام سے ندی میں کود پڑیں۔ تب کئی قبائلی پل پر بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے اور ان بہتی ہوئی لاشوں پر فائر کرنے لگے۔

میں ٹھیک نہیں بتا سکتی کہ کتنی عورتیں اور بچے ندی کی بھینٹ ہو گئے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ رات کو ہم جتنی عورتیں کمرے میں بچی تھیں ان میں سے صرف میں اور وہ تین عورتیں جو میرے پاس بیٹھی تھیں ندی میں نہیں کودیں میں دل پر پتھر رکھے گم صم یہ دردناک منظر دیکھ رہی تھی اور آسیب زدہ سی سوچ رہی تھی کہ ہندوستانی عورت میں آج بھی خود کو قربان کر دینے کا اتنا شدید جذبہ موجود ہے۔ اپنی عزت کے بچاؤ کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اتنے میں میرا بارہ سالہ لڑکا دوڑ کر ندی کے کنارے پہنچا میں نے اسے دیکھا اور میں اس کے پیچھے دوڑی میں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ بولا "ماں مجھے چھوڑ دو۔ میں بھی ندی میں کود کر مرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میری بہنوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے" اتنا کہتے کہتے وہ تیزی سے آگے سرکا لیکن میں نے اسے زور سے پیچھے کی طرف کھینچا اور کہا "تم بزدل ہو۔ تم بزدلوں کی طرح بغیر کچھ کئے ہی مرنا چاہتے ہو! میں تمہیں موت سے ڈرنے کے لئے نہیں کہتی لیکن ایسی موت ڈھونڈو جو تمہیں امر کر دے" لیکن وہ مطمئن نہیں ہوا۔ بولا "کوئی خاندانی عورت زندہ نہیں رہی۔ سب ندی میں کود کر مر گئیں۔ آؤ ماں تم بھی ان لڑکیوں سمیت کود پڑو۔ ہم دونوں بھائیوں کو چھوڑ دو ورنہ میں جاتا ہوں۔ میں یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا" میں بڑے شش و پنج میں پڑ گئی۔ کیا کروں نہ تو دونوں لڑکیاں ہی میرے پاس تھیں اور نہ ہی میرا دل مجھے خودکشی کرنے کی اجازت دیتا تھا۔

مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو بھگوان ہماری مدد کریں گے۔ اس لئے میں نے اُسے سمجھا کر کہا "بیٹا تم ہٹ کیوں کر رہے ہو؟ میں ندی میں کیسے کود سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہ خبر سن کر تمہارے پاپا دکھی ہوں گے۔ کم از کم جب تک مجھے ان کے بارے میں پوری خبر نہیں مل جاتی تب تک میں کچھ نہیں کر سکتی"۔

اتنے میں ایک قبائلی میرے پاس آیا اور کہنے لگا "تم چھلانگ کیوں نہیں لگاتی؟ لگاؤ ہم نہیں روکتے" میں نے کہا "میں ایسا نہیں کروں گی" یہ کہہ کر میں کنارے سے ہٹ کر سڑک پر آ گئی۔ میں نے دیکھا کئی قبائلیوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ خونیں منظر دیکھ کر یہ لوگ اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں۔ میرا حوصلہ بڑھا اور میں بے دھڑک ایک ٹولی میں جا کر کہنے لگی "اب کیوں آنسو بہاتے ہو۔ اپنے کئے پر پچھتا رہے ہو تو کیا تم ایسی ہی لڑائی یہاں لڑنے آئے

ہو۔ کیا یہ کام کرتے ہوئے تم اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہو؟ کیا تم نے خدا کو بھی بھلا دیا ہے؟ یاد رکھو یہ خون تمھارے سروں پر سوار ہو کر بولے گا؟ تمھیں اپنے کئے کا پھل ملے گا!"

میری یہ باتیں سن کر ساتھ کی عورتوں نے ٹوکا:۔ "چپ رہو۔ تم انہیں کیا کہہ رہی ہو؟ اپنے اوپر مصیبت کیوں مول لے رہی ہو؟" مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کتنوں نے میری بات کو سمجھا لیکن ایک آدمی میرے نزدیک آیا اور بولا "تم جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں تمھاری کیا مدد کروں؟" وہ کوئی عہدے دار معلوم ہوتا تھا میں اس سے کیا کہتی۔ لڑکیوں کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوں گی؟ ان سے کس طرح ملوں گی؟ میں یہی سوچ رہی تھی کہ وہ پھر بولا "میں تمھارے ساتھ ایک شریف آدمی بھیجتا ہوں۔ وہ آرام سے تمھیں جیل میں پہنچا آئے گا۔ وہاں اور بھی بچے ہوئے ہندو بند ہیں" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بچوں کو لے کر چل پڑی۔

جب ہم ذرا آگے بڑھے تو تینوں عورتیں بھی ہمارے پیچھے پیچھے آئیں اور ساتھ ہی کچھ لوگ اور بھی آ گئے جو رات کو ہمارے کمرے میں سے چھانٹ کر الگ کئے گئے تھے۔ ساتھ والی ایک عورت کو دردِ زہ ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے اسے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ لیکن جیسے تیسے روتی چلاتی وہ چلی آ رہی تھی۔

اب ہمیں شہر کی طرف جانا تھا۔ وہیں پر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں جیل تھی۔ سارا راستہ جلے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات سے بھرا ہوا

تھا۔ ہمارے ساتھ دو ایک سپاہی بھی آئے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں۔ وہ سب لوگوں سے "پاکستان زندہ باد" کہلواتے تھے اور جو نہیں کہتا تھا اسے ڈانٹتے تھے۔

جو شریف قبائلی میرے ساتھ خاص طور سے آیا تھا اس کی عمر مشکل سے بائیس برس کی تھی۔ چلتے چلتے میں اس سے ایسے ہی باتیں کرنے لگی۔ میں نے پوچھا "تم اتنی دور یہاں کیسے آئے؟" وہ کہنے لگا "پاکستان کے حکمرانوں نے قبائلیوں میں یہ بات پھیلا رکھی ہے کہ اسلام خطرے میں ہے اور ریاست میں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہو رہے ہیں۔ ہماری بہو بیٹیاں محفوظ نہیں ہیں۔" اسی پر میں نے اسے بتایا "چار دن پہلے ریاست میں سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اب تم لوگوں نے آ کر یہ طوفان پیدا کر دیا ہے" اس نے پھر وہی جواب دیا کہ "پٹھان یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی ان کی بہو بیٹیوں پر انگلی اٹھا سکے۔ پاکستان برابر یہ کہہ رہا ہے کہ ریاست میں ہماری ماں بہنوں پر حملے ہو رہے ہیں" میں کیا کہتی۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر پوچھا "کیا تمھیں کچھ تنخواہ ملتی ہے؟" وہ کہنے لگا "ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے ہمیں صرف یہی کہا ہے کہ ہندوؤں کو قتل کر دو۔ ان کی جو عورت یا لڑکی تمھیں پسند آئے لے جاؤ۔ جو مال تمھیں ملے لوٹ لو۔ گھر جلا دو۔ ہمیں صرف زمین چاہئیے" میں نے کہا "بھائی، برا نہ ماننا۔ ہم نے سنا تھا کہ پٹھان قوم بڑی بہادر ہوتی ہے لیکن جو کچھ ہم نے دیکھا وہ تو کوئی بزدل اور ذلیل بھی نہیں کرے گا تم نے اپنے ایمان کو بھلا کر یہ سب خون کئے ہیں۔ یہ تمھاری گردنوں پر سوار رہیں گے" وہ بولا "ہمارے وطن سے بہت سے لوگ لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔۔۔

۔۔۔۔ ہم نے سنا ہے کہ کشمیر میں زر بہت ہے" میں نے پوچھا" تم لوگ ہمیں جیلوں میں کیوں ٹھونس رہے ہو؟" وہ میری بات کا کچھ جواب نہ دیتے ہوئے کہنے لگا" مردوں کو تو ہم نے تقریباً ختم کر دیا ہے۔ جو پہلے دن ادھر اُدھر چھپ گئے تھے وہی تھوڑے سے بچ گئے ہیں۔ جو عورتیں بچی ہیں وہ یا تو بوڑھی ہیں یا زخمی ہیں۔ ہاں کچھ جوان عورتیں بھی جیل میں قید کر رکھی ہیں۔"

راستہ چلتے ہوئے ہمیں برابر مقامی مسلمان ملتے رہے۔ ان میں سے کچھ ہماری حالت پر دکھی تھے تو کچھ خوش بھی تھے۔ کہیں کہیں قبائلیوں کی ٹولیاں نظر پڑتی تھیں۔ کوئی ننگے پاؤں تو کوئی پھٹا پرانا جوتا پہنے ہوئے کندھوں پر بندوقیں اور گلے میں کارتوسوں کی مالا لئے ہوئے ادھر اُدھر وحشیانہ ہنسی ہنستے ہوئے گھوم رہے تھے وہ۔ کہیں کہیں تو وہ لوگ لوٹ کے مال پر آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے۔

ایک جگہ پر وہ میرے لڑکے وِمل اور لڑکی کملیش کو دیکھ کر کہنے لگے" بچوں کی یہ جوڑی کتنی خوبصورت ہے ہم چاہتے ہیں کہ انہیں ساتھ لے جائیں" ہمارے ساتھ کے سپاہی نے اپنی زبان میں ان سے کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بولے" تم جب انہیں جیل سے چھوڑو گے تو ہم وہاں سے انہیں اٹھا لائیں گے" اگر وہ چاہتے تو زبردستی ان کو چھین کر لے جا سکتے تھے۔ لیکن بھگوان جن کی مدد کرتا ہے ان کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ وہ بچوں کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔

جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے ہماری کوٹھی کی دیوار نظر آ رہی تھی تو ہم نے

گیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے سپاہی سے کہا" وہ ہمارا گھر ہے" وہ بولا" آجکل وہاں ہمارے آدمی ہیں" ہمیں اس جگہ سے آگے جانا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ یہیں بیٹھ کر اپنے اجڑے گھر کو دیکھتے رہیں کیوں کہ اب اس طرف دیکھنا جرم تھا۔ لاچار ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم جیل کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔

وہاں پر کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ ہم اندر بھیجے گئے۔ ہمارے ساتھ کے سپاہی نے سلام کیا اور ہم سے جدا ہو گیا۔ اندر آ کر دیکھا وہاں عورتیں، بچے اور مرد بھرے ہوئے ہیں ہجوم کا ہجوم ہے۔ اکثر کے ہاتھوں، ٹانگوں اور بازوؤں پر چھ چھ سات سات گولیاں لگی ہوئی ہیں جو جسم کے اندر رہنے کی وجہ سے ان کے لئے شدید درد کا باعث بن رہی ہیں ایک طرف ننھے ننھے بچے چار چار دن کے بھوکے پیاسے تڑپ رہے ہیں۔ کہیں کوئی اپنے بچوں کے لئے رو رہا ہے تو کوئی اپنی بیوی کیلئے۔ کسی کی لڑکی چھین لی گئی ہے اور وہ سر پیٹ رہا ہے۔ ان گنت دوشیزاؤں نے اپنی صورت بگاڑنے کے لئے چہروں پر گوبر، مٹی اور کیچڑ مل رکھا ہے یہ منظر دیکھ کر میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی لیکن تبھی میں نے وہاں شیو دیال اور اوم پرکاش کو دیکھا۔ وہ بھی میرے پاس آئے اور ہمیں ایک کمرے میں لے گئے۔ کمرہ کیسا وہ تو جہنم کا نمونہ تھا۔

(۷)

وزیر صاحب کی قربانی

میں کمرے میں ایک طرف پڑی ہوئی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئی بیٹھتے ہی میں نے نشٹھوریال اور اوم پرکاش سے مہتا صاحب کے بارے میں پوچھا۔۔۔ان کے ساتھ جیل کا پہلے کا داروغہ بھی تھا۔ وہ بولا "ماتاجی، کیا کہوں۔ کچھ کہتے نہیں بنتا مہتا صاحب کو تو پہلے دن ہی۔۔۔۔۔"

لمحہ بھر میں میں سب کچھ سمجھ گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سارا بدن کانپنے لگا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ میری جان ابھی نکل جائے گی۔ پانچ منٹ تک میری ایسی ہی حالت رہی۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا اور اس سے پوچھا "کیا تم پورا حال بتا سکتے ہو؟" تب اوم بولا "میں اسوقت وہیں پر تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر آپ سے نہیں کہا۔ میں جانتا تھا کہ آپ یہ سن کر آپے سے باہر ہو جائیں گی۔ کیا تعجب کہ آپ اسوقت بچوں کو لے کر کوٹھی میں آجاتیں یا آگ میں کود پڑتیں۔ آپ ضرور کچھ نہ کچھ کر گذرتیں اور یہ بچے برباد ہو جاتے۔ اگر آپ کہیں بچی بھی رہتیں تب بھی آپ کی ہمت ٹوٹ جاتی۔ سوچئے تو آپ اتنی مصیبتیں کس طرح برداشت کر پاتیں؟" میں نے

روتے ہوئے کہا "تم نے یہ کیا کیا انہوں نے اپنے آپ کو وطن کے لئے کو مٹا دیا۔ لیکن میں نے کیا کیا میں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جیتے جی کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ تم اگر اس وقت مجھ سے کہہ دیتے تو میں کوٹھی میں جا کر بچوں سمیت وہیں جان دے دیتی۔ لیکن اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ پاس میں موت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ لڑکیاں بھی ابھی تک نہیں آئیں ہیں" مجھے اس طرح ماتم کرتے دیکھ کر وہ بولا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب آپ مر جائیں گی تب میں اُسی جگہ جہاں وزیر صاحب نے جان دی ہے آپ کا بھی سنسکار کر دوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کتنی ہی مصیبت کیوں نہ اٹھانی پڑے" بھولا اوم تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ خبر سنتے ہی میری جان نکل جائے گی۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔ لیکن ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا اور دیکھنا باقی تھا۔ میں نے کہا "اس وقت موت بھی ہم سے نفرت کرتی ہے وہ ہمارے پاس نہیں پھٹکتی۔ اچھا، لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے" یہ سن کر داروغہ بولا "باہر سب لوگوں میں وزیر صاحب کی قربانی کا ذکر ہے اور انہوں نے بڑی بہادری سے سچائی پر جان دی ہے۔ آپ اوم سے پوچھئے" داروغہ کہتا تھا جب وزیر صاحب اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس، سب انسپکٹر پولیس اور تیتیس پولیس کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر ہائی اسکول کی طرف گئے جہاں کچھ دن پہلے ایک توپ گاڑ کر رکھی گئی تھی وہاں تو ڈوگرے سپاہی تعینات تھے لیکن وہ بھاگ آئے تھے۔ سب نے مہتا صاحب کو وہاں جانے سے روکا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور چل دئے۔ وہاں کوئی سپاہی نہیں تھا ہاں کچھ وہیں کے مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ وہ وزیر صاحب سے کہنے لگے، تو نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے ہمیں تیری شرافت کا لحاظ ہے ہم چاہتے

ڈر گیا لیکن وہ ویسے ہی کھڑے رہے۔ مجھ سے کہنے لگے "تمھاری ماتاجی کیوں بھاگی
یہ بھاگنے کا نہیں قربانی کا وقت تھا۔ میں اس لئے گھر آیا تھا کہ سب مل کر موت کو گلے
لگائیں گے۔" میں نے آہستہ سے کہا "آپ یہاں سے چلے جائیے۔ اندر سانٹھ قبائلی
ہیں۔ لیکن وہ وہیں ڈٹے رہے۔" یہ کہہ کر اوم بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اس
سے کہا "اوم وہ جانتے تھے کہ موت کی ساتھی موت ہی ہے اور کوئی نہیں۔ میں بھول
تھی جو بھاگ آئی۔ اب اس کا پھل بھوگ رہی ہوں۔ اچھا، آگے کیا ہوا۔ وہ بولا
"اتنے میں قبائلی باہر نکل آتے۔ وزیر صاحب کو دیکھ کر سب نے بندوقیں تان لیں
اور کہا "کافر! پاکستان منظور کرو اور سر سے ہیٹ اتارو۔ وہ خاموش رہے۔ پھر
قبائلی کہنے لگے "بتاؤ تو ہندو ہے یا مسلمان۔ پھر بھی وہ خاموش رہے اتنے میں ہمارے
پڑوس کا ایک مسلمان وہاں آیا اور وزیر صاحب سے کہنے لگا "صاحب کہہ دو
میں مسلمان ہوں۔ بچ جاؤ گے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کیوں اپنی جان
سے ہاتھ دھوتے ہو۔ اتنے میں قبائلیوں نے پھر پوچھا 'تم ہندو ہو یا مسلمان؟ اس
بار وزیر صاحب نے کہا "میں ہندو ہوں مسلمان نہیں، بس پھر کیا تھا سب نے
بندوقیں تان لیں۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ تین فائر پہ فائر ہوتے۔
چھاتی آگے کئے وہ منہ سے رام۔۔۔۔۔۔ رام۔۔۔۔۔ کہتے گئے۔ چھوتھی گولی
لگنے پر وہ نیچے گر پڑے۔ میں یہ خونریزی دیکھ کر بھاگا بھاگا تمہارے پاس آیا۔
مجھے اس وقت کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ تبھی تو میں اس وقت رو رہا تھا۔" وہ خاموش
ہو گیا میں نے آسیب زدہ سی حالت میں پھر پوچھا "تمھیں اس سے آگے کا کچھ حال
معلوم ہے؟ وہ بولا "شیو دیال کو معلوم ہے۔ میں نے شیو دیال سے پوچھا "کہو

شیو دیال۔ ان کی لاش کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟" وہ کہنے لگا "میرے ساتھ کا دوسرا
ساتھی رامچند آپ کی کوٹھی کے راستے ہی سے بھاگا تھا۔ راستے میں اس نے
وزیر صاحب کی لاش پڑی دیکھی۔ وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت وہاں پڑوس کا ایک
مسلمان آیا۔ ان دونوں نے لاش کو اٹھا کر آپ کی کوٹھی کے سونے کے کمرے
میں رکھا اور ان کے پاؤں کی چپل اتار دی۔ بعد میں کوٹھی کو آگ لگائی گئی تو لاش کا
سنسکار بھی وہیں ہو گیا۔ میں نے بہت سے مسلمانوں سے سنا ہے کہ جب قبائلی
انہیں مار کر باہر آئے تو کہتے تھے "کہ آج ہم نے ایک ڈوگرہ جوان مارا ہے۔" اس کی
بہادری ہمیں دیر تک یاد رہے گی۔ ہمیں اسے زندہ گرفتار کرنے کا حکم تھا لیکن اس
نے ایسے جواب دئے کہ ہمیں غصہ آگیا اور ہم نے فائر کر کے اسے ختم کر دیا"
میں نے پوچھا "کیا انہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کے وزیر ہیں" شیو دیال بولا "وہ تو
ان کا امتحان لے رہے تھے ورنہ وہ لوگ جانتے تھے کہ وہ وزیر ہیں اور یہ ان کا
مکان ہے" یہ سن کر میری آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو پھر پھوٹ پڑے۔ جلد ہی
میں سنبھلی اور بولی "مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنے فرض کو پورا کیا۔ سچ مچ
چھپنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ وہ شروع سے ہی سچائی کے پجاری تھے آخری
وقت میں بھی انھوں نے سچ ہی کو اپنایا اور اس کے لئے اپنی جان تک دیدی" میں نے
بچوں سے بھی کہا "بیٹا دیکھو تمھارے پاپا کی کیسی شاندار موت ہوئی۔ یہ سبق تمھیں
بھی سیکھنا ہے۔ سو مجھے تب خوشی ہو گی جب ہم سب انہیں کی طرح اپنا فرض نبھاتے
ہوئے ہنستے ہنستے اپنی قربانی دیں گے۔ تم خوش نصیب بچے ہو۔ تمھارا باپ بہادر
تھا" پھر ہم سب نے عہد کیا کہ ہم ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے ان کے



آنجہانی دنی چند مہتا

ہیں کہ تو اپنی جان یوں ہی نہ گنوا اس وقت تو کچھ نہیں کر سکتا۔ پاکستانی ہزاروں کی تعداد میں آئے ہیں تیرے ساتھ ہم بھلا کرتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں چھپا کر ہم تجھے بچائیں گے۔ لیکن انہوں نے کسی کی بات نہ مانی بلکہ ان سے کہا، تمھارے ملک پر مصیبت آئی ہوا سے مل کر بچاؤ۔ تم لوگ الٹا مجھے چھپنے کے لئے کہہ رہے ہو؟ چلو جہاں پولیس ہے وہاں جا کر ہم مورچہ لگائیں، لیکن وہاں ان کی کون سنتا تھا انہوں نے پکار پکار کر سب کو مقابلے کے لئے لانا چاہا لیکن سب لوگ، یہاں تک کہ پولیس کے سپاہی بھی تتر بتر ہو گئے کچھ تھوڑے سے آدمی ان کے ساتھ وہاں آئے جہاں پولیس کا گروپ تھا۔ وہاں بھی کسی نے مورچہ نہیں بنایا جب وہاں ان کی کوئی ماننے والا ہی نہ تھا تب وہ کیا کرتے۔ مجبور ہو کر انھوں نے کہا، میں نے مقابلہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے اب میں تمھیں نہیں بچا سکتا۔ میں اب گھر جاتا ہوں وہاں جانا بھی میرا فرض ہے۔ لوگوں نے کہا" تمھارے گھر میں بہت سے قبائلی گھس گئے ہیں وہاں مت جاؤ" لیکن وہ کیا ماننے والے تھے۔ وہ اپنی کوٹھی کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ ایک راجپوت پولیس سب انسپکٹر تھا۔ وہ پھاٹک کے باہر رہا اور وزیر صاحب اندر گئے"۔ اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا گلا بھر آیا کہنے لگا" آگے کا حال اوم سے پوچھئے" میں نے مڑ کر اوم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا" جب مہتا صاحب اندر آئے تب میں باتھ روم میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کھڑکی کے شیشے میں سے اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی پوچھا" اوم تمھاری ماتا جی کہاں ہیں؟" میں نے انہیں ہاتھ سے زیارت گاہ کی طرف اشارہ کیا۔ میرے اشارے کا مطلب سمجھ کر پولیس افسر تو پیچھے واپس

متبرک نام پر دھبہ لگے۔ یا جس سے ان کی روح کو تکلیف پہنچے۔ اس وقت میں پاگلوں کی طرح انھیں اپدیش دے رہی تھی۔ کیا وہ معصوم بچے میری بات کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔ رو کر نہیں بلکہ ان کی بہادری کی باتیں یاد کر کے۔ جب آدمی کو چاروں طرف سے بہت سی مصیبتیں گھیر لیتی ہیں تو خود بخود اس کے حوصلے ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا لڑکیوں کے لئے میری فکر بڑھتی جا رہی تھی۔

(۸)

میری کمزوری اور میری طاقت

جس جیل میں ہم قیدی تھے اس میں برابر تین دن سے لوگوں کو لا لا کر بند کیا جا رہا تھا۔ تیسرے دن انہیں کچھ گوشت روٹی دی گئی وہ کسی کسی نے کھائی کئی ایک نے تو اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ان کے لئے راشن کا انتظام ہو رہا تھا۔ ان گنت عورت مرد پاس کے کھیتوں میں جا کر ایکھ توڑ لیتے تھے اور انھیں سے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ وہ ایک عجیب منظر تھا۔ عورتیں وہاں روتی بھی جاتی تھیں اور کھاتی بھی جاتی تھیں۔ اچانک وہاں ہلچل مچ گئی۔ میرے پوچھنے پر ساتھ کی عورتیں

کہنے لگیں "دیکھو وہ پاکستانی آ رہے ہیں۔ یہ لوگ دن کے وقت کمروں میں گھوم گھوم کر عورتوں کو پسند کرتے ہیں اور پھر رات کو لے جاتے ہیں۔ تین دن سے یہاں پر یہی ہو رہا ہے۔ باپ کی نظروں کے سامنے بیٹی کو اور خاوند کے سامنے بیوی کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ ماؤں کی گود سے بچے پھینک دئے جاتے ہیں۔ تنگ آ کر کئی عورتیں زہر کھا کر مر گئیں۔ کئی ایک نے کھڑکیوں کے شیشوں کا چورن کھا کر جان دینے کی کوشش کی اور ابھی وہ پوری طرح مر بھی نہ پائی تھیں کہ ان کے ماں باپ انہیں کرشن گنگا میں پھینک آئے۔ کئی عورتیں خود ندی میں کود پڑیں لیکن پاکستانی ان میں سے کچھ کو نکال لائے اور اب انھیں تنگ کرتے ہیں"۔

اتنے میں کچھ لوگ ہمارے کمرے میں آتے اور چاروں طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے انہیں دیکھ کر عورتوں کے ہوش اڑ گئے وہ آپس میں کہنے لگیں نہ جانے اب کس کو لے جائیں گے؟ پاکستانیوں نے کچھ ہندو چنے اور انہیں راشن وغیرہ کے کام پر لگا دیا گیا کھانے پینے میں لوگ اس طرح مصروف تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ دنیا میں پیٹ کی آگ سے شدید اور کوئی آگ نہیں ہے۔

شیو دیال اور اوم بھی کہیں سے گنے اور بھٹے لے آئے بچوں کو دو دن سے کچھ نہیں ملا تھا۔ میں نے چار دن سے سوائے بھنے ہوئے اس کاشی پھل کے ایک ٹکڑے اور کچھ مکی کے دانوں کے اور کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو دن سے پانی تک نہ پیا تھا۔ کھانے کی کچھ خواہش بھی نہ تھی۔ میں نے اوپر سے چاہے کتنی ہی ہمت باندھ رکھی تھی لیکن اندر سے ان کی جدائی میں میرا دل چکنا چور ہو گیا

تھا۔ زندگی پھیکی سی معلوم ہو رہی تھی۔ دل اسی کشمکش میں تھا کہ میں نے اس وقت گھر سے نکل کر اچھا کیا یا برا؟ کہیں میں نے ان سے ساتھ دھوکہ تو نہیں کیا۔ اگر وہ خواب میں ایک بار بھی یہ کہہ دیں کہ میں بے قصور ہوں میں نے جو کچھ کیا اچھا کیا تو مجھے بڑی شانتی ملے۔ پھر سوچتی انہوں نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے۔ ان کی قربانی کے باعث میرا سر ہمیشہ فخر سے اونچا رہے گا۔ اب میرا فرض ہے کہ چاہے مجھے کتنی ہی مشکلیں کیوں نہ جھیلنی پڑیں میں رو کر یا بزدل بن کر ان کی قربانی پر دھبّہ نہ لگاؤں اور کبھی بچوں کے سامنے کمزوری کی باتیں نہ کروں۔ اگر میں ان کا حوصلہ بڑھاتی رہی تو شاید ایک دن ان کا نام بھی روشن ہوگا۔ مصیبت انہیں اچھے برے کا فرق سمجھا دے گی۔

میں جیل میں مشکل سے تین گھنٹے بیٹھی ہوں گی کہ اتنے میں ایک نوجوان سنتری چمن لال میرے پاس آیا اور کہنے لگا "جی وزیر صاحب سے ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے لیکن اب بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہو گیا۔ میں آپ سے اس وقت ایک خاص بات کہنے آیا ہوں آپ کی کوٹھی میں پاکستانیوں کے دو سردار ٹھہرے ہیں۔ ان کے پاس کچھ فوج بھی ہے۔ اس وقت مظفر آباد کا سارا انتظام انہیں کے ہاتھ میں ہے انہیں میں سے ایک سردار نے آپ کو بلانے کے لئے اپنا بھائی بھیجا ہے۔ آپ چلئے۔" یہ سن کر مجھے نہ جانے کیا ہوا۔ اچھے برے کی تمیز جاتی رہی۔ میں نے اپنے بالوں سے آہستہ آہستہ ایک لال ریشم کی ڈوری جو اتفاق سے اس دن پہنی تھی کھینچی۔ میں نے نظر بچا کر اسے اپنے گلے میں ڈالا اور اتنے زور سے کھینچا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔ بیہوش ہوتے ہی میرے دانت بیٹھ گئے۔ آنکھیں

پتھرا گئیں لیکن میں مری نہیں۔ بچے اور اوم میری یہ حالت دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ کوئی منہ پر پانی چھڑکنے لگا کوئی میرے ہاتھ پاؤں ملنے لگا۔ چمن کو کچھ شک ہوا۔ اس نے میرے سر کے دوپٹے کو سرکایا تو دیکھا کہ گلے میں پھانسی ہے۔ جلدی سے اس نے گانٹھ کھولی کچھ لمحے بعد مجھے ہوش تو آ گیا لیکن کمزوری بہت محسوس ہونے لگی۔ اس وقت میں نے سوچا "اس وقت موت بھی مجھے اپنے پاس نہیں بلاتی وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی طرح میرے دل میں کوند گیا۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ تو نے یہ کیا کیا۔۔۔۔ تو تو کئی بار خاوند کے سامنے یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اگر عورت میں طاقت ہو تو ہزاروں آدمیوں کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔ وہ یہ سن کر ہنس دیتے تھے آج میرے اسی دعوے کا امتحان ہو رہا تھا لیکن میں ڈر گئی یہ خیال دل میں آتے ہی میں اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور چمن سے بولی "کہاں ہے سردار کا بھائی؟ اسے جلدی بلاؤ" پھانسی سے دم گھٹنے کی وجہ سے میرے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اوپر کا حصہ کچھ سفید اور نیچے کا کچھ نیلا سا دھبے دار ہو گیا تھا کچھ منٹ کے بعد چمن دو آدمیوں کو اندر لایا۔ آتے ہی انہوں نے سلام کیا اور کہا "آپ کو ہمارے سردار یاد کر رہے ہیں" میں نے کہا "میں سب کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"

اور میں سب کو ساتھ لے کر پہلی بار اپنے اجڑے ہوئے گھر کو دیکھنے چل پڑی۔ دل میں نہ خوف تھا نہ فکر۔ اسی راستے پر جہاں کبھی ہم بڑی شان سے چلا کرتے تھے، آج ہم ننگے پاؤں اور پھٹے حال جا رہے تھے انسانی زندگی بھی کیا ہے۔ کبھی عرش پر کبھی فرش پر!! ہم کوٹھی پہنچے، وہ جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ صرف رسوئی

گھر اور مہمانوں کے کچھ کمرے بچے ہوئے تھے کئی قبائلی بندوقیں لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے باہر کے میدان میں ان کا سردار بھی ادھر ادھر گھوم رہا تھا تقریباً پچاس برس کا وہ قبائلی جسے کٹھائی کا خان کہتے تھے۔ شلوار اور قمیض پہنے پستول اور کارتوسوں سے سجا ہوا تھا۔

ہم پہنچے تو ہمارے ساتھ کا آدمی پہلے اطلاع دینے کے لئے اس کے پاس گیا۔ سردار نے ہمیں آنے کی اجازت دی۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا "سردار، فقیر کا سلام" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے وزیر صاحب کے مرنے کا افسوس ہے وہ ایک شیر دل انسان تھا" وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے کسی نامعلوم تحریک کے زیر اثر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "خان، تم کس کے لئے افسوس ظاہر کر رہے ہو؟ کیا وہ بزدل تھے؟ کیا انہوں نے خوف کی وجہ سے دھرم سے منہ موڑا؟ افسوس تو تب ہوتا جب وہ جھک جاتے یا چار دن کی زندگی کے لئے اپنا فرض بھول جاتے میں ایک خوش نصیب عورت ہوں کیوں کہ میرے شوہر نے اپنا فرض نبھایا ہے اس دن میں اپنے آپ کو بھی خوش نصیب مانوں گی جس دن میرے دونوں بیٹے اپنے باپ کی طرح ہنستے ہوئے وطن کی نذر ہو جائیں گے۔ اگر تمہارا اسلام تمھیں اجازت دیتا ہے تو اپنے ان آدمیوں سے ان پر فائر کرنے کو کہو۔ تم دیکھو گے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی چھاتیوں پر گولیاں کھانا جانتے ہیں" یہ کہہ کر میں نے دونوں کو آگے کیا اور ان سے کہا "بیٹا موت کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاؤ انہیں دکھاؤ کہ بہادر لوگ کیسے اپنی چھاتی پر گولیاں کھاتے ہیں" دونوں لڑکے سامنے آئے۔ آنکھیں بند کر کے وہ چھاتی تان کر کھڑے ہو گئے

اور کہنے لگے "خان، اپنے آدمیوں کو اجازت دو کہ وہ ہم پر وار کریں"

بچوں کی ہمت دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ جو آدمی ہمارے سامنے کھڑا تھا وہ بندوق نیچی کر کے بچوں کے پاس آیا۔ اس نے میرے بڑے لڑکے کو بڑے پیار سے چھاتی سے لگا لیا یہ دیکھ کر سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ خان خود بھی بہت رویا اور کہنے لگا "بہن، تم خوش نصیب ہو۔ خدا تمہارے بچوں کو سلامت رکھے ایک دن ملک میں ان کا نام روشن ہو گا۔ کتنے بے خوف ہیں یہ معصوم بچے! تم نے ان کے دلوں پر کیا جادو کر دیا ہے؟ ان چار دنوں میں ہم نے ایسا کوئی بھی انسان نہیں دیکھا جو ہمارے سامنے ان کی طرح تن کر کھڑا ہوا ہو" میں نے کہا "میں کچھ نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہے لیکن میں نے شروع سے ہی بچوں کو فرض پورا کرنا سکھایا ہے۔ ہم سب مر مٹیں گے لیکن فرض سے منہ نہیں موڑیں گے" وہ بولا "سنو بہن! آج بھی تم ہماری ویسی وزیرانی ہو جیسے اپنے مالک کے جیتے جی تھیں۔ ہمارے دل میں تمہاری عزت ہے۔ ہم یہ کمرے تمہارے لئے خالی کئے دیتے ہیں۔ تم یہاں آرام سے رہو۔ تمہاری بچیاں کہاں ہیں، یہ ہمیں معلوم ہے۔ ہم ابھی انہیں تمہارے پاس بلوا دیتے ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہمیں کا ایک مسلمان خاندان رہتا ہے وہاں ہمارا ایک آدمی کسی کام سے گیا تھا۔ وہیں وہ دونوں لڑکیاں اس نے دیکھیں۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تم کس کی لڑکیاں ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ وزیر صاحب کی! ساتھ ہی کہا کہ ہمیں دو قبائلی یہاں چھوڑ گئے ہیں اور گھر والوں سے ہمیں اچھی طرح رکھنے کی ہدایت کر گئے ہیں۔ وہ اب تک نہیں آئے۔ ہم ان کے انتظار میں ہیں۔ اس پر میرے آدمی نے ان سے پوچھا کہ کیا تمھیں ان پر بھروسہ ہے؟"

لڑکیوں نے جواب دیا" ہاں"۔ انہوں نے اب تک ہمارے ساتھ جیسا برتاؤ کیا ہے اسے دیکھ کر ہمیں ان پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ صبح ہمیں ہماری ماں کے پاس سے لے آتے تھے۔ پہلے وہ ہمیں ایک گھر میں لے گئے۔ گھر والوں سے پوچھا کہ وہاں قبائلی تو نہیں آتے و آتے ہیں" ایسا جواب پاتے ہی وہ ہمیں دوسرے گھر میں لے گئے۔ وہاں بھی مناسب جگہ نہ دیکھ کر وہ ہمیں یہاں تیسری جگہ لاکر چھوڑ گئے ہیں۔ ہمارے آدمی نے ان سے پوچھا۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھاری ماں جیل میں ہے؟ انہوں نے کہا" ہاں! ان دونوں نے ہمیں ایسا ہی بتایا تھا۔ پھر میرے آدمی نے تمھاری پہچان کے لئے نشانی پوچھی تو انہوں نے وہ بتائی۔ اب اس آدمی نے انہیں ساتھ آنے کو کہا لیکن وہ نہیں مانیں کہنے لگیں۔ جب تک ہماری ماں ہمیں حکم نہ دیگی تب تک ہم تمھارے ساتھ نہ آسکیں گے' یہ سب باتیں اس نے مجھ سے آکر کہیں تب میں نے جیل میں تمھاری تلاش کروائی۔ اب میں اپنے آدمی کو انہیں یہاں لانے کے لئے بھیج رہا ہوں لیکن ساتھ میں تمھاری کوئی نشانی چاہیئے تاکہ انھیں تمھارے حکم کا یقین ہو" میں نے ویسا ہی کیا۔ اور وہ آدمی میری لڑکیوں کو لینے چلا گیا۔

(۹)

وہ متبرک پھول (ہڈیاں)

میرے حوصلے کا ایک اور امتحان ہوا۔ میں اپنے سونے کے کمرے کی طرف

گئی۔ وہاں ان کا سنسکار ہی تھا۔ وہ کمرہ سارے کا سارا جل گیا تھا اور وہ خوبصورت جسم بھی جو چار دن پہلے اچھی حالت میں تھا۔ اسی کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اوپر سے چھت کے گرنے کی وجہ سے پھول (ہڈیاں) دروازے تک پھیلے ہوتے تھے۔ میں یہ سب دیکھ کر دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے دروازے تک جاتے ہوئے کہا" دھنیہ ہو پربھو! تم نے میری یہ پرتگیا پوری کی" سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا" مجھے روکنا مت۔ میں لاش کے سنسکار کی آخری رسم پوری کرنا چاہتی ہوں" اس پر انہوں نے سوال کیا" کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ تمہارے مالک کی ہی لاش ہے" میں نے اسی جوش میں جواب دیا" ہاں میرا ہاتھ کسی دوسرے کے پھولوں کو نہیں چھو سکتا" ایک شخص نے پھر میرا امتحان لینا چاہا۔ کہنے لگا" سنو' ان کی لاش کو ہم نے بھنگیوں سے نیچے پھنکوا دیا تھا" میں نے جواب دیا" نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے دھوکہ مت دو۔ یہ میرے شوہر کے پھول ہیں' دیکھو۔ مجھے ان میں سے خوشبو آرہی ہے"

اس کے بعد انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنا دوپٹہ پھاڑا۔ اس میں سب پھول باندھے۔ پھر باہر آئی۔ وہاں خان تھا۔ لڑکیاں بھی اتنی دیر میں آگئی تھیں۔ میں نے انھیں دیکھ کر یونہی جوش میں آکر کہا" تم بزدل ہو۔ میں سمجھتی تھی کہ تم ختم ہو چکی ہو گی لیکن تم ابھی تک زندہ ہو" لڑکیوں نے جواب دیا" ماں' اگر ہم پر کوئی آفت آتی تو تم کبھی ہمیں زندہ نہ پاتیں۔ اگر کبھی وقت آیا تو تم دیکھ لینا ماں! کہ تمھاری لڑکیاں ہنستے ہنستے جان دینا جانتی ہیں" خان کا آدمی بولا" تم قسمت والی ہو۔ تمھاری بیٹیاں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ان کی ہمت میں نے تبھی دیکھ لی تھی جب تمھارے حکم کے بنا انہوں نے

آنے سے انکار کر دیا تھا۔"

یہ باتیں ختم ہوتے ہی دونوں لڑکیاں پتا کے بارے میں پوچھنے لگیں میں نے کپڑے میں بندھے ہوئے پھول دکھا کر کہا "یہ ہیں تمہارے پاپا" وہ رونے لگیں۔ میں نے انہیں رونے سے منع کرتے ہوئے کہا "ایسی شاندار قربانی پر رو کر ان کی شان کم نہ کرو" اور تو سب خاموش ہو گئے لیکن سرلش بہت روئی۔ میں نے اس کے پاس جا کر آہستہ آہستہ کہا "سنو، سرلش، یہ رونے کا وقت نہیں ہے اور یہ ایک دن کا رونا نہیں ہے۔ یہ تو زندگی بھر کا رونا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے انھیں مارا ہے ان کے سامنے مت روؤ"، یہ سن کر وہ بھی خاموش ہو گئی۔

اپنی گود میں گٹھری رکھے میں وہیں میدان میں بیٹھ گئی اور ہاتھ باندھ کر پرارتھنا کرنے لگی "ہے بھگوان! تمہاری امانت میں خوشی سے تمھیں دیتی ہوں۔ مجھے طاقت دو کہ میں یہ دُکھ برداشت کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنے فرض کو پورا کیا، بھاگے نہیں۔ یہی ان کی شان تھی۔ اسی طرح، اے بھگوان! امتحان چاہے کتنا سخت لینا لیکن مجھے بے حوصلہ نہ کرنا۔ ایشور مجھے ہمت دو کہ میں بھی اپنے فرض کو نبھا سکوں"، یہ سب میں اونچی آواز میں کہہ رہی تھی اور وہ سب لوگ سُن رہے تھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے پاگل سمجھ رہے تھے۔

سردار نے ہمارے لئے کمرے خالی کرنے کا حکم دیا تین کمرے خالی ہوئے۔ رسوئی گھر میں ہمارے جو برتن تھے وہ ہمیں دے دیئے گئے۔ کھانے پینے کا سب سامان ملا۔ بستر لا کر میرے سامنے رکھ دئے گئے۔ میں نے ان سے کہا "مہربانی کر کے میرے سامنے سے یہ سب سامان ہٹا لو۔ آج میں ان چیزوں میں سے کسی کو

بھی ہاتھ نہ لگاؤں گی۔ ان کے پاک جسم کے پھول میرے ہاتھ میں ہیں۔ جب تک انھیں ٹھکانے نہ لگا دوں، میں ان لوٹ کی چیزوں کو نہیں چھوؤنگی۔ انہیں ایسی چیزوں سے بڑی نفرت تھی" انھوں نے سب چیزیں اٹھا کر کمروں میں رکھ دیں۔

تبھی مجھے یاد آیا کہ یہاں کے جنگل کے ڈی ایف او سنت رام مودی کی بیوی بھی جیل میں ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتی تھی اور اسے موسی کہتی تھی وہ بڑی شریف اور سیدھی سادھی عورت تھی۔ میں نے سردار سے کہا "میری موسی جیل میں ہے مہربانی کر کے اسے بھی بلوا دیجیے"۔

تھوڑی دیر میں کچھ آدمی اُسے گھاس کی بنی ہوئی ایک چارپائی پر ڈال کر لائے اس کے ساتھ اس کا ایک نوکر اور مودی جی کے دفتر کے ایک کلرک کی لڑکی کملا تھی وہ لڑکی میری بڑی لڑکی کی ہم عمر تھی۔ وہ آدمی موسی کو کمرے میں لے آئے۔ اس کے کپڑے خون سے سرخ تھے۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی اسی سے خون بہہ رہا تھا۔ کھانسی اسے زوروں کی تھی۔ سانس بڑی مشکل سے آرہا تھا میں نے پاس جا کر اس کے شوہر، لڑکے اور ساتھ والی لڑکی کے باپ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کملا کے بارے میں کہا "اس کا باپ اسے میرے حوالے کر گیا تھا۔ سنا ہے کہ وہ مارا گیا ہے۔ وہ ایک کشمیری پنڈت تھا۔

اب ہم سب مل کر بارہ افراد ہو گئے۔ سات بچے اور پانچ بڑے۔ سب کو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اوم وغیرہ کو کھانا بنانے پر مجبور کیا۔ کہا "اٹھو، کھانا بناؤ۔ جب تک دنیا میں جینا ہے سب کچھ کرنا ہے" وہ اٹھے۔ سب نے مل کر کھانا بنایا۔ آج بچوں کو چار دن کے بعد پیٹ بھر کھانا ملا لیکن شریمتی مودی

اور میں نے کچھ نہ کھایا۔

سردار نے اپنا ڈیرا پاس ہی ڈاکٹر کی کوٹھی کے پیچھے کمروں میں لگایا لیکن ان کے آنے جانے والے سپاہیوں اور قبائلیوں کا کھانا ہماری کوٹھی میں ہی پکتا رہا۔ جب سردار جانے لگا تو کمرے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے مجھ سے پوچھا "بہن! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگا "رات کو یہاں تمہارا رہنا اچھا نہیں ہے۔ ہم باہر دو سپاہیوں کا پہرہ لگا رہے ہیں"

رات ہوئی تو سب بچے بستر بچھا کر سو گئے۔ بچاروں کو کئی دن کے بعد آرام کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ وہ بھول گئے کہ ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں رات بھر گودی میں پھول لئے بیٹھی رہی اور بھگوان کا نام لیتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے ایسا دھوکہ ہوتا کہ میری گودی میں پھول بل رہے ہیں۔

صبح سب اٹھے۔ میں نے دونوں لڑکوں سے کہا "تمھیں کرشن گنگا میں پھول بہانے دو میل جانا ہوگا۔ اسی وجہ سے تمھارے پاپا نے تمھارا یگیوپویت (گلے میں جنیو ڈالنے کی رسم) کیا تھا" میں نے شیو دیال سے بھی ان کے ساتھ جانے کو کہا۔ وہ بولے "ماتا جی، ہم جاتے تو ہیں لیکن تم جانتی ہو کہ ہندوؤں کو دیکھتے ہی وہ مار دیتے ہیں۔ ہاں اگر خان ہمارے ساتھ سپاہی کر دے تو کام بن سکتا ہے" میں نے بڑے لڑکے کو خان کے پاس بھیجا۔ سردار نے اپنی موٹر دی۔ دونوں لڑکے اور شیو دیال ایک سپاہی کو ساتھ لے کر موٹر پر دو میل گئے۔ عجیب سی بات ہے کہ جن لوگوں نے وزیر صاحب کو موت کے گھاٹ اتارا وہی ان کے پھولوں کو بہانے کے لئے موٹر دے گئے۔

گھنٹے بھر کے بعد وہ ان پھولوں کو سنگم پر بہا کر لوٹ آئے۔ کچھ دیر بعد دونوں

سردار بھی آئے اور باہر کھڑے ہو کر انہوں نے کہا "تم بے فکر ہو کر رہو۔ اب کوئی ڈر نہیں ہے۔ خدا تمھارا مددگار ہے۔ ہم سب مورچے پر جا رہے ہیں۔ شام کو لوٹ کر آئیں گے۔ ہمارے لئے دعا کیجئے کہ ہمیں کامیابی ہو" میں نے کہا "بھگوان تمھیں نیک کاموں میں لگائے۔ میرا یہی آشیرواد ہے لیکن میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا کسی ملک پر فتح حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ وہاں کی جنتا کو مار کر، اُن کے گھر بار جلا کر، عورتوں کی بے عزتی کر کے اور بے انصافی کا ڈنکا بجاتے ہوئے آگے بڑھو؟ معاف کرنا، یہ گڑھا جنھوں نے کھودا ہے، وہ خود اس میں گریں گے۔ آخر ہم سب بھگوان کی اولاد ہیں۔ ہمیں برے بھلے کی پہچان کرنی چاہیئے" بات کڑوی تھی لیکن وہ خفا نہیں ہوئے۔ انھوں نے بڑی شانتی سے جواب دیا "اب تک جو ہوا سو ہوا لیکن اب سب ٹھیک ہوگا" اور وہ چلے گئے۔

(۱۰)

پھر اجڑے ہوئے گھر میں

دس بج گئے تھے۔ میں نہانا چاہتی تھی لیکن میرے پاس بدلنے کے لئے کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔ بدن پر کے کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے ایک مقامی دھوبی کے پاس ہمارے کپڑے گئے تھے۔ شاید وہ دے دے،

اس امید پر میں نے ایک سپاہی کے ساتھ شیو دیال کو وہاں بھیجا۔ لیکن دھوبی نے یہ کہہ کر کہ اس کے سب کپڑے لوٹ لئے گئے ہیں انکار کر دیا۔ جب ان لوگوں نے بہت کہا تو اس نے ایک دھوتی اور ایک جمپر دیا۔ میں نہائی۔ صابن تو تھا نہیں آٹا ملا۔ اسی سے سر کے بال دھوتے۔ نہانے کے بعد مجھے کچھ زیادہ کمزوری محسوس ہونے لگی۔ پانچ دن سے کھانا نہ کھایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غش کھا کر گر پڑوں گی میری یہ حالت دیکھ کر شریمتی مودی کا نوکر کھانا پکانے لگا۔

میں سوچنے لگی جنھوں نے میرے خاوند کو مارا ہے کیا اب مجھے انہیں کے یہاں کھانا کھانا پڑے گا۔ میں کتنی پاپی ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بچوں کو سمجھانا شروع کیا "میں جانتی ہوں کہ مفت کا کھانا اچھا نہیں ہے اس لئے سردار سے کہہ کر کوئی چھوٹا موٹا کام تمھیں دلا دوں گی جس سے ہمارے دل میں بھی یہ جذبہ رہے کہ ہم حق کا کھا رہے ہیں۔ اگرچہ ہم نے سب کچھ گنوا دیا ہے لیکن خود اعتمادی نہیں گنوائی ہے۔ تم کسی کی دھونس نہ سہنا کوئی کچھ پوچھے تو صحیح جواب دینا۔ اگر تم سچ پر اڑے رہے اور بہادروں کی طرح مصیبتوں کا سامنا کیا تو تمھارا ملک تم پر فخر کرے گا۔"

اتنے میں کھانا بن گیا۔ چودھا کھانے پر زور دینے لگا۔ ہماری خواہش تو نہیں تھی لیکن کمزوری کے باعث ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کھائے بغیر رہنا مشکل ہے یہ سوچ کر ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ لیکن ساتھ ہی زندگی بھر دن میں ایک بار کھانا کھانے کا برت لیا۔

اس دن بہت سے مقامی مسلمان وہاں آ کر وزیر صاحب کی موت پر افسوس

ظاہر کرنے لگے۔ مجھے یہ برا لگا۔ میں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس پر وہ لوگ ان کی باتیں سنانے لگے۔ ایک بولا "اس دن ہم انہیں شہر میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ تمھیں اطلاع دیں لیکن کچھ نہ ہو سکا۔ کتنی ہی بار ہم نے ان سے چھپ جانے کو کہا لیکن وہ ایک نہ مانے ان کی بہادرانہ موت کا چرچا سب کی زبان پر ہے!"

اس کے بعد جو بھی میرے پاس آتا افسوس ظاہر کرنے کے بجائے ان کی قربانی کی تعریف کرتا تھا۔

قبائلیوں کا لنگر ابھی ہماری کوٹھی کے رسوئی گھر میں ہی تھا۔ وہاں قبائلیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں آتیں اور وہ ہمیں کھڑکیوں میں سے گھور گھور کر دیکھتے تھے پہرے داروں کے منع کرنے پر بھی وہ نہ مانتے تھے۔ کبھی کبھی تو کوئی غصہ میں آ کر کہہ دیتا "مشرقی پنجاب میں سکھوں نے ہماری بہنوں پر جو ظلم کئے ہیں اس کا بدلہ ہم یہاں ان سے لے رہے ہیں۔ میں جواب دیتی "کیا وہاں کا بدلہ یہاں لینا انصاف ہے؟" لیکن انہوں نے میری اس بات پر کبھی کوئی توجہ نہ دی۔

اس رات شریمتی مودی کو زور کی کھانسی آئی۔ ساتھ ہی بخار بھی چڑھا۔ کئی دنوں سے اسے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اس کا زخم بہت گہرا تھا۔ کملا کے پاؤں میں بھی گولی لگی تھی لیکن اس کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ صبح کے وقت وہ دونوں سردار آئے۔ کہنے لگے "بہن! اگر آپ ایبٹ آباد جا کر رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔ وہاں آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ ہم آپ کو وہاں ایک کوٹھی دیں گے۔ بچوں کی پڑھائی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ جب آپ کا لڑکا بڑا ہو گا تو اسے اس کے باپ کی جگہ

ملے گی۔ یہ بچے ایک دن بڑے لائق بنیں گے اور آپ کے دن پھریں گے۔" میں
نے جواب دیا "میں ابھی کہیں نہیں جاؤں گی۔ وہیں رہوں گی جہاں میرے شوہر
مجھے چھوڑ گئے ہیں۔ ہاں میری بات مانیے۔ ان عورتوں پر جو جیل میں ہیں آپ
مہربانی کیجیے" وہ بولے "ہم نے شہر کے سب لوگ جیل سے نکال کر گھروں
میں بسا دیے ہیں" میں نے پھر کہا "ہمیں بھی کوئی کام دیجیے تاکہ ہم محنت کی
کمائی کھائیں۔ کیا میں دکھی لوگوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں؟" وہ کہنے لگے "نہیں، ابھی
آپ آرام کیجیے۔ یہ کام آپ کے کرنے کے لائق نہیں ہے۔" اور وہ دونوں چلے
گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنی رسوئی میں سے جہاں ان لوگوں کا کھانا پکتا تھا ہو کر گئے
اور وہاں کے لوگوں سے کہہ گئے "دیکھو بھائی! مرغ وغیرہ بناتا ہو شوق سے بنانا
لیکن گائے کا گوشت اس وقت تک نہ بنانا جب تک یہ یہاں ہیں۔ اگر تم نے
ان کا دل دکھایا تو اچھا نہ ہوگا۔"

میں نے ان کے آدمی سے شریمتی مودی کے لئے ڈاکٹر بلانے کو کہا۔ اس
وقت وہاں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ صرف دو کشمیری کمپاؤنڈر زندہ بچے ہوئے
تھے۔ وہ انھیں کو لے آئے۔ انہوں نے شریمتی مودی اور کملا کے زخموں پر
دوائی لگائی۔

ادھر جب میرے منہ بولے بھائی کو میرا حال معلوم ہوا تو وہ اور اس
کا باپ دونوں مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ بھائی نے بھگوان کا بہت بہت
شکریہ ادا کیا اور کہا "آپ پر خدا کی بڑی مہربانی ہے بہن! جب اس دن میں
آپ کے پاس تھا تو میرے پیچھے میرے گھر میں سے قبائلیوں نے تلاشی لیتے

ہوئے میری عورت کے سب کپڑے زیور چھین لئے لیکن آپ کے زیور میرے گھر
میں موجود ہیں۔ وہ آپ کی امانت ہیں۔ کل میں انہیں ساتھ لیتا آؤں گا" میں نے
جواب دیا "میں نے تو تمھیں دے دیے ہیں" وہ قسم کھا کر بولا "میں ان میں سے ایک
بھی نہ لوں گا۔ تم ہی انھیں اپنے پاس رکھو۔ کسی وقت ان بچوں کے کام آئیں
گے۔" اب میں اور کیا کہتی بولی "اچھا کل لا دینا۔ جب کبھی اپنے ملک میں جاؤں
گی، تب تمھارے لئے جو کچھ بھی بھیج سکوں گی بھیجوں گی" وہ چلا گیا۔

سریش خان کے آدمیوں کے ساتھ پھرتا رہتا تھا ایک دن باہر سے آ کر
پوچھنے لگا "ماں! ہماری ذات کیا ہے؟" میں نے کہا "تمھیں تو معلوم ہے۔ ہم
ویش مہاجن ہیں" "دیکھو ماتا جی" وہ بولا "یہ لوگ مجھ سے میری ذات پوچھ رہے
تھے میں نے بتا دیا کہ ہم مہاجن ہیں۔ اس پر وہ آپس میں کہنے لگے۔ مہاجن قوم
بڑی بہادر ہوتی ہے۔ یہ لڑکا ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ اس کے پاپا نے بھی بڑی بہادری
سے گولیاں کھائیں، لیکن ماں! تم تو کہتی تھیں راجپوت لوگ بہادر ہوتے ہیں"
میں نے جواب دیا "ہاں بیٹا، راجپوت تو بہادر ہوتے ہی ہیں لیکن اور قوموں
میں سے بھی ایسے لوگ نکل آتے ہیں جو اس قوم کی شان بڑھاتے ہیں" پھر وہ
میری آنکھوں کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیرا تو وہ
بھی ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "سریش بیٹا! تم یہ کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولا
"ماں! مجھے اپنی آنکھوں کی طرف دیکھنے دو" میں نے حیرانی سے پوچھا "کیوں
کیا بات ہے" وہ کہنے لگا "جو شخص ہمیں جیل میں بلانے کے لئے آیا تھا وہ
سردار کا بھائی ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ تمھاری ماں کوئی معمولی عورت

نہیں ہے۔ ہم اس کی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں آگ ہے۔ ماں! میں تمھاری آنکھوں میں وہی آگ کھوج رہا ہوں۔ لیکن مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ میں نے اُسے سمجھایا "بیٹا! بات یہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آتے ہیں تو میں انہیں ان کے ظلموں کی یاد دلاتی ہوں۔ انہیں اپنے پاپوں پر افسوس ہوتا ہے شاید انہیں میری آنکھوں میں اپنی پاپ کی مورت نظر آتی ہو۔ ویسے آگ کبھی کسی کی آنکھوں میں نہیں ہوتی۔" میں ابھی اس سے بات کر ہی رہی تھی کہ ہمارے تین ساتھی باہر سے گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے "ماتا جی! بارہ مولے تک تو یہ لوگ پہنچ چکے ہیں۔ بڑی سخت لڑائی ہو رہی ہے کہتے ہیں کہ ایک دو دن میں سرینگر پہنچ جائیں گے" میں نے کہا "چاہے لاکھ کوشش کریں یہ لوگ کبھی سرینگر نہیں پہنچ سکتے" وہ تینوں ہنسنے لگے "آپ انہیں کیا سمجھ رہی ہیں۔ بس دو دن اور لگیں گے"

اس کے بعد جب وہ دونوں سردار آئے تو ان کے ساتھ دو پاکستانی افسر بھی تھے۔ ان میں سے ایک ضلع ہزارہ کی پولیس کا کپتان تھا۔ وہ ذات کا پٹھان تھا دوسرا تھا رحم داد خاں! جسے لوگ ضلع ہزارہ کا 'اکسٹرا کمشنر' کہتے تھے۔ دونوں نے آتے ہی دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا۔ پھر رحم داد خاں بولا "مجھے آپ لوگوں کے اس حال پر اور وزیر صاحب کی موت پر افسوس ہے" میں نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا "کیا کبھی بہادروں کی موت پر افسوس کیا جاتا ہے؟ آپ بھی ایسا نہ کریں مجھے اپنی حالت پر ذرا بھی دکھ نہیں ہے۔ مجھے تو آپ سے ایک بات کہنا ہے۔ آپ نہتوں، خاص طور سے عورتوں پر ظلم کیوں کرتے

ہیں؟ آپ تو پٹھان ہیں۔" اس پر کپتان بولا "اب بہادروں کی طرح لڑائی ہوگی اور عالمگیر لڑائی ہوگی ایک طرف ہوائی جہاز ہوں گے دوسری طرف بندوقیں۔ ہم دنیا کو بتا دیں گے کہ بہادر کس طرح لڑتے ہیں" رحم داد خاں کہنے لگا "میں نے ان بچوں کی ہمت کی باتیں سنی ہیں۔ خدا انہیں بچائے۔ ایک دن ان کا نام روشن ہوگا پٹھان بہادروں کی عزت کرتے ہیں۔ بہن میں تمھاری ہمت دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ پٹھان تمھیں بہن کہہ چکا ہے۔ وہ اس رشتے کو آخر تک نبھائے گا۔ تم یہاں خوشی سے رہو۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب یہاں کا وزیر تمھاری دیکھ بھال کرے گا۔ وہ تمھارے لئے راشن کا اور ہر چیز کا انتظام کرے گا۔ میں نے کہا "تم نے مجھے بہن کہا ہے۔ اب بہن کی ایک عرض بھی سن لو۔ شہر میں جو ظلم ہو رہے ہیں انہیں بھگوان کے لئے بند کروا دو۔" "میں سب ٹھیک کر دوں گا" وہ بولا "اب کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا۔"

پولیس کپتان نے مجھ سے پوچھا "یہاں کے کپتان کا کیا ہوا؟" میں نے کہا "اس کا خاندان یہاں نہیں تھا" وہ بولا "ہاں اس حملے سے تین دن پہلے میں یہاں آیا تھا اور سب سے مل کر گیا تھا۔ کشمیر سے بھی کئی افسر آئے تھے ان سب سے بھی ملا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی فتح پر مسکرایا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "آپ تو یہاں کا حال چال دیکھنے آئے تھے لیکن یہاں کا محکمہ حکومت لمبی کروٹ سو رہا تھا۔"

کچھ دنوں کے بعد پھر آنے کی بات کہہ کر وہ دونوں چلے گئے۔ جس پولیس کپتان کا یہ ذکر کر رہے تھے وہ مہتا صاحب کے ساتھ ہی گھر سے نکلا تھا اور کسی دوست کے ہاں چھپ گیا تھا۔ پاکستانیوں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور دومیل کے ڈاک بنگلے کے پاس جب وہ ندی پر پانی پینے جا رہا تھا گولی سے مار

دیا گیا تھا۔ اسی طرح اور لاتعداد افسروں کو انہوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہاں کا تحصیلدار پنڈت تاراچند کہیں چھپ گیا تھا۔ نئے حاکموں نے اُسے بھی ڈھونڈ نکالا اور مقامی وزیر بنایا۔ سُنا جاتا تھا کہ انہیں کشمیر پنڈتوں سے رعایت کرنے کی ہدایت ہے۔ نئے انتظام نے کئی مسلمانوں کو بھی چھوٹی چھوٹی نوکریوں پر مقرر کر دیا تھا۔ ریٹائرڈ فوجی مسلمانوں سے وہ یہ اپیل کرتے تھے کہ روپے میں سے چار آنے ہمیں امداد دو۔ جب وہ اس پر بھی راضی نہ ہوتے تھے تو پھر بار بار "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگا کر انہیں مذہب کے نام پر ابھارتے تھے۔

(۱۱)

مسلمان بھی ڈرنے لگے

اس طرح دن گذر رہے تھے۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ کیوں کہ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ کوئی بھی آکر کچھ کر سکتا تھا لیکن جب وہ میرے پاس آتے تو شاید رحمت داد خاں کے خوف کے باعث ادب سے پیش آتے تھے۔

ایک دن از خود ہی میرے منہ سے ایک بات نکلی "کاش کہ ان کا ایک فوٹو ہی بچا ہوتا۔" میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ستیش ہاتھ میں ایک فوٹو لئے دوڑا دوڑا

میرے پاس آیا۔ میں نے دیکھا وہ نگیٹیو سمیت ان کا فوٹو تھا۔ پوچھا "یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟" وہ بولا "میں باہر میدان میں گھوم رہا تھا۔ پھولوں کی اس جھاڑی کے نیچے میں نے کچھ چمکتی ہوئی چیز دیکھی۔ پاس گیا تو یہ ملے۔"

ہمیں راشن کی بڑی تکلیف تھی۔ جو کچھ وہاں ملتا تھا وہ کافی نہیں تھا۔ ایسی حالت میں ایک دن رحمت داد خاں نے دو من آٹے کی ایک بوری، کچھ گھی، دال اور چائے وغیرہ بھجوائی۔ شوہر کے قاتلوں سے مفت کی چیزیں لیتے ہوئے مجھے بے حد تکلیف ہوتی لیکن نہ لیتی تو بچے کیا کھاتے! پھر رحم داد خاں مجھے بہن کہہ چکا تھا۔ مجھے وہ چیزیں لینی پڑیں۔ رحم داد خاں کی وجہ سے ہر افسر ہماری خیریت دریافت کیا جاتا تھا۔ ایک دن نیا وزیر، پچھلا مال افسر اور نائب تحصیلدار (جو اب تحصیلدار بنایا گیا تھا) یہ سب ہمارے پاس آئے۔ مال افسر اور تحصیلدار دونوں کشمیری مسلمان تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اپنی حالت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولے "ہم تو یہاں جیتے جی نرک بھوگ رہے ہیں اس سے تو مرنا ہی اچھا ہے" ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ افسر بننے پر بھی انہیں ضرور کچھ تکلیف ہے۔ میں نے بھی انہیں ڈھارس دی اور کہا "کل کی فکر مت کرو۔ بھگوان جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔ اپنا فرض ادا کرتے جاؤ۔ میری طرف بھی دیکھو سوائے بھگوان کے میرا اور کون ہے؟ لڑکیوں کے ساتھ ان لوگوں میں رہ رہی ہوں۔ سر تلوار کی دھار کے نیچے ہے لیکن گھبراتی نہیں۔ مجھے بزدلی سے چڑ ہے" وہ بولے "اب تک آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ سب ہم سن چکے ہیں۔ یہ لوگ تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں۔ رحم داد خاں نے سب کو تمہاری دیکھ

بحال کرنے کو کہا ہے" رحم داد خاں نے ایک ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کو بھی شریمتی مودی کے علاج کے لئے بھیجا۔ یہ دونوں فوجی پٹھان تھے۔ دیکھنے آئے اور دوائی دے کر چلے گئے۔

بچے ویسے تو ٹھیک چل رہے تھے لیکن سب سے چھوٹا بچہ صبح اٹھ کر کھانے کو کچھ مانگتا تھا میں اس کے لئے رات کی باسی روٹی رکھ چھوڑتی تھی۔ وہ بہت سخت ہو جاتی تھی چباتے چباتے ایک دن اس کے گلے میں درد ہونے لگا۔ وہ کہنے لگا "ماں، یہ روٹی چبائی نہیں جاتی گلے میں لگتی ہے" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے مجھے بھی دکھ ہوا لیکن میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹا تو تو ہر وقت کہا کرتا ہے کہ میں بہادر بنوں گا۔ کیا یہی تمہاری بہادری ہے؟ تجھے تو سوکھی روٹی کھانے کو مل جاتی ہے۔ لیکن تیرے ہزاروں بھائی بہن اس کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترستے رہتے ہیں" چار دن بعد وہ بولا "ماں اب مجھے یہ روٹی بسکٹ کی طرح لگتی ہے"

ایک دن وِل کو زور کا بخار آگیا۔ دو دن تک اترا ہی نہیں۔ بچہ بھوک اور بخار سے چھٹپٹا رہا تھا۔ میرے پاس دودھ اور دوا منگوانے کے لئے بھی پیسے نہ تھے بس صرف بھگوان پر بھروسہ تھا۔ میں ہر وقت اسی سے پرارتھنا کرتی رہتی تھی۔ اتفاق سے ایک دن سردار رحم داد خاں وہاں آیا۔ بچے کو تڑپتا دیکھ کر وہ دس روپے دودھ کے لئے دینے لگا جب میں نے روپے دیکھے تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ سوچا، کیا اب ان سے روپے بھی لینے ہوں گے۔ مجھے اس کشمکش میں دیکھ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا "بہن! میں تمہاری تکلیف

کو سمجھتا ہوں لیکن انسان وہی ہے جو حالات کے مطابق اپنے کو ڈھال لے۔ کیا تم مجھے بھائی نہیں سمجھتیں؟ اگر سمجھتی ہو لے لو۔ اگر تمہارے والد یا بھائی تمہیں کوئی چیز دیتے تو کیا تم نہ لیتیں۔ اس نے روپے وِل کے ہاتھ میں تھما دئے اور مجھ سے کہا "بہن! میں بارہ مولا جا رہا ہوں۔ وہاں بھی تمہیں یاد رکھوں گا۔ وہاں سے آنے پر تمہارا سب انتظام ٹھیک کر دوں گا"

اس وقت بارہ مولا میں شدید جنگ ہو رہی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد اچانک ہمارے یہاں سے سرداروں کا لنگر بند ہو گیا۔ کوئی پہرہ نہ تھا۔ اب وہ دو سردار بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ صرف ہم ہی ہم اس اجڑے ہوئے گھر میں رہ گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔۔۔ کیا بات ہے؟ ادھر قبائلی شہر کے دوبارہ آباد ہوتے چند ہندوؤں کو پھر سے لوٹنے اور تنگ کرنے لگے۔ شہر میں بے چینی پھیل گئی۔ اب مقامی مسلمان بھی ان سے تنگ آگئے تھے۔ وہ پاکستانی چال کو سمجھ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ہندوؤں سے کہنے لگے "جب وہ لوگ تمہاری لڑکیاں لیں گے تو ہم ان کے مقابلے میں تمہارا ساتھ دیں گے" دراصل انہیں ہندوستانی فوج کے مقابلے پر آنے کا پتہ چل گیا تھا وہ خوف زدہ تھے کہ اگر ہم نے ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا تو نہ جانے ہندوستانی فوج ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے! اپنے بچاؤ کی انہیں یہی ترکیب سوجھی۔

ایک دن چمن لال آکر مجھ سے کہنے لگا "آپ یہاں نہ رہیں۔ یہ جگہ سڑک کے پاس ہے۔ سن رہے ہیں کہ یہ لوگ پیچھے ہٹ رہے ہیں مظفر آباد میں اس وقت مقامی باشندوں اور کچھ معمولی افسروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ہار

کر پیچھے ہٹتے ہوتے یہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے گھر چلیئے۔"

میں نے کہا "دو دن بعد سوچ کر جواب دوں گی۔"

(۱۲)

یہ نیک انسان

آخر ہندوستانی ہوائی جہاز آسمان میں منڈلانے لگے۔ انھیں ہر روز شہر پر اڑان کرتے ہوئے دیکھ کر ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری کوٹھی پر چکر لگاتے ہیں دو میل پر بم گرنے کی دل دہلا دینے والی آواز سے سبھی چونک اٹھتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری چھت ابھی گری۔ قبائلیوں نے ہوائی جہاز کا نام "خدا کا بچہ" رکھا تھا۔ اس سے وہ لوگ بہت گھبراتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ انہیں کچھ اشارہ کریں لیکن کیسے کریں، یہ نہ جانتے تھے۔

ایک دن شام کے وقت ہم تیل کا دیا جلائے بیٹھے تھے۔ یہ غیر معمولی سی بات تھی کیوں کہ اکثر ہم اندھیرے میں ہی بیٹھا کرتے تھے۔ تبھی دس بیس پاکستانی فوجی ہمارے احاطے میں آئے۔ ہم نے ان کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی دیا بجھا دیا یہ دیکھ کر وہ بگڑ اٹھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ان سے کہا "دیکھو بھائی، اس

میں ہمارا کیا قصور ہے؟ آپ ہی بتلایئے ہمارے پاس اتنا تیل کہاں ہے جو دیا جلائے رکھیں۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو جلائے دیتے ہیں۔ کیا میں دروازہ کھولوں؟" یہ سن کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے اور کہنے لگے "نہیں، ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ صرف یہ پوچھنا ہے کہ یہاں جو فوجی لنگر تھا وہ کہاں گیا؟" میں نے کہا "کئی دن سے ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔"

"اچھا تو ہم جلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان کے اس طرح جانے سے سب کو حیرت ہوئی انہیں دنوں شہر میں ایک دن بڑی ہلچل مچی۔ بات یہ تھی کہ پاکستانی لوگ لڑکیوں کو گھروں سے نکال نکال کر لے جانے لگے تھے۔ اس وقت کئی شریف مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ اگر کہیں وہ شروع سے ہی اس طرح ساتھ دیتے تو کسی کی کیا مجال تھی کہ کسی کا بال بھی بیکا ہو جاتا۔ پھر بھی ان میں سے بہت سے آدمی اس قتل وغارت کے خلاف تھے۔ لیکن ان کی کون سنتا تھا۔ ایسی حالت میں شریمتی مودی مجھ سے کہنے لگی "تمہارا بے مطلب کی ہٹ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کون جانتا ہے ان لڑکیوں پر کیا آفت آ جاتے" اس کی باتیں سن کر میں بھی گھبرا گئی اور چمن لال کے گھر سامان لے جانے کی اجازت دے دی۔ سامان لے کر وہ تینوں آدمی چلے ہی تھے کہ راستے میں پولیس افسر مل گیا۔ اس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" وہ بولے "کسی کے گھر رہیں گے۔ ماتا جی کہتی ہیں کہ اس اجاڑ میں رہنا اچھا نہیں" اس پر پولیس والے نے کہا "تمہیں ماتا جی سے کہو کہ ہم انہیں کہیں نہ جانے دیں گے۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ میں رات کو پہرہ لگا دوں گا۔" وہ بستر لے کر واپس لوٹ آتے اور مجھے ساری

بات سنائی رات بھر دیکھتے رہے کوئی پہرے دار نہ آیا۔ صبح سنا کہ جہاں ہم جا رہے تھے وہاں سے اسی رات قبائلیوں نے لڑکیاں چھین لیں اور سامان لوٹ لیا۔ اس مکان میں کئی ہندو خاندان رہ رہے تھے۔ جب میں نے یہ سنا تو میرے دل میں پکا یقین ہو گیا کہ خدائی طاقت ہماری مدد کر رہی ہے۔ بعد میں ہم نے اس پولیس والے افسر کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے وہ تین چار دن بہت بے چینی اور گھبراہٹ میں کاٹے۔

بعد میں خبر آئی کہ ہندوستانی بہادروں نے دشمنوں سے بارہ مولہ چھین لیا ہے قبائلیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پاکستانی فوج کے افسر انہیں پیٹ پیٹ کر زبردستی مورچے پر جانے کو مجبور کرنے لگے لیکن وہ ہزاروں کی تعداد میں واپس بھاگے۔ لوٹتے ہوتے راستے میں جو کچھ ملتا تھا وہی لوٹ کرتے جاتے تھے۔ ہم نے یہاں تک سنا کہ ان کی جیبوں میں بہت سے کٹے ہوتے ہاتھ اور کان دیکھے گئے۔ بات یہ تھی کہ بھاگتے ہوتے ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اطمینان سے گہنے اتارتے اس لئے وہ تلوار سے گہنوں سمیت کان اور ہاتھ کاٹ لیتے تھے۔ اس وحشیانہ منظر سے مظفر آباد کے باشندے بہت خوفزدہ ہوتے۔

ہمیں اب اپنی کوٹھی میں آتے سترہ دن ہو چکے تھے۔ ایک روز ہمیں دن کے چار بجے دل دہلا دینے والی چیخ و پکار سنائی دی۔ اسے سن کر شریمتی مودی کہنے لگی "معلوم ہوتا ہے لٹیرے بہت بڑی تعداد میں لڑکیاں لے جا رہے ہیں۔ نہ جانے اب ہماری ان معصوم بچیوں کا کیا ہوگا؟" میں نے بھی گھبراہٹ میں کہا "اب کیا کروں؟ ندی پاس ہوتی تو ہم سب اس میں ڈوب مرتے۔ اب یہ روز روز کی تکلیفیں برداشت نہیں ہوتیں" میں یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کوٹھی کے سامنے سے آواز آئی "بہن جی لڑکیوں

کو ساتھ لے کر جلدی سے باہر آئیو، دیکھو یہ ظالم لٹیرے عورتوں اور معصوم لڑکیوں کو لئے جا رہے ہیں؟" میں حیران تھی کہ یہ کون بلا رہا تھا۔ میں اُسے خاص طور پر نہ جانتی تھی شریمتی مودی پہلے تو انجان مسلمان پر یقین نہ کرنے کو کہنے لگی لیکن جب میں نے اُسے یقین دلایا کہ ہم وہاں پر بحفاظت رہیں گے تو وہ مان گئی اور ہم سب جلدی سے مولوی کے گھر پہنچے۔ مولوی نے بتایا "میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب چیخ و پکار سنی تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے آپ کے گھر کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اس لیئے میں نے آپ کو پکارا یہاں آپ اچھی طرح رہ سکتی ہیں کیوں کہ یہاں کوئی نہ آئے گا۔"

دوسرے دن سنا کہ کچھ لٹیرے اس رات ہماری کوٹھی میں گھسے تھے۔ شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔

ہم نے دیکھا کہ مولوی کے گھر ہماری کوٹھی کا کچھ فرنیچر تھا۔ بچے دیکھ کر کہنے لگے "ماں، دیکھو یہ ہماری چیزیں ہیں" میں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا "اگر یہ چیزیں جل گئی ہوتیں تو کیا ہوتا؟ اچھا ہوا جو وہ کسی کے کام آ گئیں میں خوش ہوں اور تمھیں بھی اس پر خوش ہونا چاہیے۔" یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

ان دنوں وہاں کے مسلمان بھی مارے خوف کے پاکستان بھاگے جا رہے تھے۔ یہ افواہ تھی کہ ہندوستانی سکھ فوج مسلمانوں کو بلا تمیز مارتی کاٹتی چلی آ رہی ہے۔ ایک رات تو بیچ مچ سارے مسلمان بھاگنے کو تیار ہو گئے۔ مولوی بھی بہت گھبرایا۔ اس کی بیوی رونے لگی۔ مولوی کی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ ان میاں بیوی کو انہیں کی زیادہ فکر تھی۔ رات کو وہ لوگ بہت پریشان رہے۔ چیخ سن کر میں اٹھی اور دیکھا باہر ایک بہت بڑا ہجوم اسی طرح گھبرا رہا ہے۔ میں ان کے بیچ میں جا کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی

"بھائیو! کہیں مت جاؤ۔ تمھیں کوئی نہیں مارے گا یہ سب پاکستان کا جھوٹا پروپگنڈا ہے"

وہ بولے "دیکھو، جموں میں کیا ہوا ہے جب وہ یہاں کے ہندوؤں کی بری حالت دیکھیں گے اور دیکھیں گے کہ شہر لاشوں سے بھرا ہوا ہے تو کیا وہ ہمیں زندہ چھوڑیں گے" میں نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمھیں بچاؤں گی۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ بچے اور اپنی جان ہے۔ تم سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاؤ۔ میں سب کے آگے رہوں گی پہلی گولی میرے سینے میں لگے گی۔ بعد میں تمھاری باری آئے گی جب ہماری فوج دو میل پہنچے گی تب ہم سب مل کر وہاں چلیں گے۔ میں سب سے آگے جھنڈا لے کر چلوں گی۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اپنی قربانی دے کر بھی میں تمھیں بچاؤں گی!"

میری ان باتوں کا ان پر پورا اثر ہوا اور وہ سب کے سب میرے دائیں بائیں پھرنے لگے۔ کچھ لوگ مجھ سے بولے "تمھیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس کس نے پاکستانیوں کا ساتھ دیا ہے۔ انہیں ہم نے نہیں بلایا تھا۔ ہم سب ہندو مسلمان ایک تھے۔ انہوں نے باہر سے آ کر یہاں یہ قہر برپا کیا ہے!"

مجھے ان کی اس گھبراہٹ پر بڑا رحم آ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جیسے بھی ہو انہیں بچانا چاہیئے۔ مجھے خواب میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ چونکہ ان لوگوں نے مجھے اتنا نقصان پہنچایا ہے اس لئے مجھے ان کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔

میرے پاس سے وہ لوگ عبدالعزیز نامی ایک شخص کے پاس گئے اور انہیں میری سب باتیں کہہ سنائیں۔ انہوں نے کہا "وہ جو کچھ کہتی ہے، سچ کہتی ہے۔ تم اس کی اچھی طرح سے حفاظت کرو وہ وقت آنے پر تمھیں بچائے گی۔ میری طرف سے بھی ان سے

درخواست کرنا کہ اگر وہ چاہے تو میرے گھر آ کر خوشی سے رہ سکتی ہے!"

دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو دوسرے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہیں ان میں قوم، مذہب، رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ عبدالعزیز اسی طرح کا ایک فرشتہ سیرت انسان تھا۔ پیدائش سے مسلمان، پیشے کا درزی۔ وہ شروع سے ہی کشمیر نیشنل کانفرنس کا رکن اور مقامی جدوجہد کا لیڈر رہا تھا۔ حملے سے کچھ دن پہلے ہی جیل سے چھوٹ کر آیا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ہندو عورتوں پر ہر ممکن وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔ وہ گلیوں میں دربدر بھٹک رہی ہیں۔ انہیں رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو اس سچے اور نیک انسان نے شیر کی طرح دلیر بن کر چار سو ہندو عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا۔ اپنا سامان باہر رکھا۔ کھانا باہر پکوایا لیکن مظلوم بہنوں کو عزت کی جگہ دی۔ پاکستانیوں نے اسے بہت تنگ کیا لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا تھا ہے "تم مجھے جان سے مار دو لیکن میں ایک بہن کو بھی گھر سے نہیں نکالوں گا" اسی بات پر قبائلیوں نے پہلے تو اس کا سب سامان لوٹ لیا لیکن جب وہ اس پر بھی نہ مانا تو ایک دن ان ظالموں نے اسے پکڑ کر قید کر لیا۔ بعد میں سنا کہ انہوں نے اسے جان سے مار ڈالا۔

عبدالعزیز کی تائید کے بعد سب نے میرا کہا مان لیا۔ دو دن بعد جب حالات کچھ سدھرے تو وہ لوگ مجھ سے کہنے لگے "بہن! تو نے اس دن ہمارے پانچسو آدمیوں کو بے گھر ہونے سے بچا لیا۔ تیرے احسانات ہم کبھی نہ بھولیں گے"۔

(۱۳)

مولوی کے گھر میں

اب مسلمانوں میں بھی قبائلیوں کا ڈر بڑھنے لگا تھا کیوں کہ وہ لوگ بھاگتے وقت انہیں بھی لوٹ لیتے تھے۔ ہم نے تو یہاں تک سنا کہ وہ لوگ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو بھی اٹھائے جاتے تھے مولوی بھی ڈرا ــــ اس نے اپنے صندوق وغیرہ دیوار میں رکھ کر اوپر لکڑی کے تختے لگا دئے اور پھر انہیں مٹی سے پوت دیا۔

اسی خوف کے باعث مسلمان اب دن رات قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب قبائلی آئیں گے تو انہیں قرآن پڑھتے دیکھ کر تنگ نہ کریں گے لیکن ان کا یہ خیال درست نہ نکلا۔ ایک دن قبائلیوں کی ایک ٹولی ایک کشمیری مالدار مسلمان کا گھر لوٹنے لگی۔ وہ قرآن پاک پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا "بھائی میں بھی مسلمان ہوں اور تم بھی مسلمان ہو دیکھو میں اس وقت قرآن شریف پڑھ رہا ہوں تمھیں اس کی تو عزت کرنی چاہیئے" انہوں نے جواب دیا "ہمارا مذہب زر ہے۔ تم کیا پڑھ رہے ہو؟ اس کی ہمیں بالکل پرواہ نہیں ہے"

اور انہوں نے اس کا سب سامان لوٹ لیا۔ سنا گیا کہ انہوں نے قرآن شریف

تک کے اوراق پھاڑ کر ادھر ادھر پھینک دئے۔ جس کی وجہ سے مقامی مسلمانوں میں بڑی کھلبلی مچی اور بعد میں پاکستانیوں کو ایک ایسی ٹولی وہاں بھیجنی پڑی جو روزانہ مسجد میں جاکر نماز پڑھتی تھی۔ یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ مقامی مسلمانوں کو ان کے سچے مسلمان ہونے کا یقین ہو جائے۔

موجودہ وزیر پنڈت تاراچند کبھی کبھی میرے پاس آکر میری ضروریات کے بارے میں پوچھ تاچھ کر جاتا تھا۔ میں اُسے اکثر اداس پاتی تھی۔ نہ جانے یہ لوگ اسے کتنی تکلیف دیتے تھے وہ منہ سے کچھ نہ کہتا تھا لیکن اس کی مایوس کن آنکھیں سب حال صاف صاف بتا دیتی تھیں۔ اس کی دو نوجوان لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ وہ لڑکیوں کی وجہ سے وہاں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ اس کی وزارت چھین لی گئی ہے اور بے چارے کے پاس سر چھپانے تک کا ٹھکانہ نہیں ہے کسی طرح ایک مسلمان درزی کے پاس جگہ ملی۔ آخر اسی غم میں ایک دن وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ سنا گیا کہ اس کی لاش کو قبر میں دفنا دیا گیا۔ بعد میں اس کے تینوں بچے شرنارتھیوں کے ساتھ ریڈ کراس کی مدد سے وہاں سے نکل آئے۔

جب وہ پہلی بار میرے پاس آیا تھا تو اس کے ساتھ ایک کشمیری مسلمان تھا۔ وہ پچھلا مال افسر تھا۔ اس کا خاندان سرینگر میں تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد نہ جانے کیسے وہ سری نگر پہنچ گیا۔ پچھلے دن وہ مجھے سری نگر میں ملا۔ کہنے لگا "اگر تم اس دن میری ہمت نہ بندھاتی تو میں اپنے بیوی بچوں کو نہ پاسکتا"

اس طرح ہمیں مولوی کے گھر میں رہتے دس دن بیت گئے۔ آٹا ختم ہونے کو تھا۔ میرے اور شریمتی مودی کے ایک وقت کے کھانے سے کچھ بچت ضرور ہوتی تھی۔ پھر بھی

خرچ بہت تھا۔ اکثر مولوی مجھ سے کہتا "بہن جی، اناج کے بغیر آپ کا کیا ہوگا" میں اس سے کہہ دیتی "جس نے آج تک بچایا ہے، وہی آگے بھی بچاتے گا۔"

پہننے کے کپڑے بھی پھٹ گئے۔ نئے بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے دن میں پھٹے ہوئے کپڑوں میں ہی پیوند اور ٹکڑے لگا لیتی تھی۔ صابن نہیں تھا۔ اس لئے گرم پانی میں راکھ ڈال کر کپڑوں کو ابال لیتی تھی۔ ایک دن باہر کے کچھ بچوں کو میرے بچوں نے اپنے کپڑے پہنے ہوتے دیکھا اور میرے پاس آکر آنسو بھری نظروں سے باری باری کہنے لگے "ماتاجی، دیکھو اس نے میرا فراک پہنا ہے۔ تم ہمیں ان سے یہ مانگ دو نا۔ دیکھو ہمیں کتنی سردی لگتی ہے۔ ہمارے کپڑے ہمیں واپس دلا دو ماں۔" میں نے جواب دیا "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کپڑوں کو ہی سب کچھ سمجھتے ہو۔ کیا میں ان کپڑوں کے لئے جھگڑا مول لوں۔ مانگنا تو دور رہا میں تو انہیں یہ جتانا بھی نہیں چاہتی کہ یہ ہماری چیزیں ہیں۔ جہاں تمھارے پاپا چلے گئے وہاں پر گھر کا سب آرام بھی گیا۔ جاؤ جن بچوں نے تمھارے کپڑے پہنے ہیں ان سے محبت سے کھیلو اور انہیں اس بات کا علم نہ ہونے دو کہ تم نے اپنے کپڑے پہچان لئے ہیں۔" یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد بھوکے پیٹ پھٹے حال رہ کر بھی انہوں نے کسی چیز کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

ایک دن شام کے وقت ہم سب بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا مولوی مسجد میں گیا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ کھول کر دیکھا تو ایک پاکستانی افسر اور تین سپاہی کچھ آدمیوں کے سر پر بوجھ لادے باہر کھڑے ہیں۔ افسر نے پوچھا وزیر صاحب کی بیوی یہاں ہیں کیا؟" ہم سب پہلے تو ایک دوسرے کا منہ تاکنے

لگے لیکن پھر فوراً ہی میں نے آگے بڑھ کر کہا "کیا بات ہے؟ میں ہوں"۔ اس نے بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا "بہن جی! میں صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہیں پتہ نہ لگ رہا تھا۔ نہ جانے ہم نے کتنے گھر چھان ڈالے۔ رحم داد خاں نے آپ کے لئے یہ راشن بھیجا ہے اور ہدایت کی ہے کہ بہن سے کہنا، فکر نہ کریں، میں کچھ دن بعد آ رہا ہوں۔ سب انتظام کر دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ راشن کی گٹھریاں رکھ کر چلے گئے۔ ان میں گڑ، نمک اور آٹا تھا۔ ان کے جانے کی کھڑکھڑاہٹ سن کر مولوی بھی بھاگا آیا اور پوچھنے لگا "بہن جی، کون تھے؟" میں نے اس سے سارا حال کہہ سنایا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "ہم نے آپ کے یہاں رہنے کا بھید چھپا رکھا تھا۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا "سنو، میں چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتی۔ میں نے اس بھگوان کی پناہ لی ہے جیسے وہ رکھے گا، رہوں گی" مولوی میری باتوں سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ دیر دیر تک میں اور وہ بھگوان کے متعلق بات چیت کرتے رہتے تھے۔ میرے پاس سے اٹھ کر وہ اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا "دیکھو جو خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں ان کی مراد کیسے پوری ہوتی ہے۔" اس کی بیوی راشن دیکھ کر چڑھ گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں گھر پر ہی سب کچھ مل جاتا اسے پسند نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا سلوک بگڑنے لگا۔ میں نے اسے راشن دے کر مطمئن کرنا چاہا لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ تو ہمیں تڑپتے ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ مولوی نے بھی اسے سمجھایا "تم ان سے کچھ نہ کہو۔ سب افسر انہیں جانتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں مصیبت اٹھانی پڑے"

ان دنوں ایک پاکستانی افسر مقامی حالات پر قابو رکھنے کے لئے یہاں آگیا تھا۔ وہ ایک شہری پٹھان تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ اس کے ساتھ تین

باہتھیار سپاہی تھے۔ وہ مجھ سے اور بچوں سے بڑی عزت سے ملا۔ اس نے ہٹ کر کے میری آپ بیتی سُنی۔ اور جب میں نے اپنے مکان کا زیور دینے کی بات بتائی تو اس نے پوچھا، "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ زیور آپ نے کس کو دیا تھا؟" میں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ تو اپنے محافظ کے ساتھ بدعہدی کرنے کی بات ہے۔ وہ خاموش ہو گیا جاتے ہوئے اس نے کہا "جب کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو مجھ سے کہنا میں جب تک یہاں ہوں آپ کی ہر طرح سے مدد کروں گا۔"

(۱۴)

میرے بھائی

کچھ دن بعد ایک روز شام کو مجھے پتہ لگا کہ رحم داد خاں آ گیا ہے میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن میں کسی بات کی فکر کئے بغیر وزیر کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں خان ٹھہرا ہوا تھا تب کچھ کچھ اندھیرا ہو چلا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کئی افسر ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ میں نے سنتری کے ذریعے رحم داد خاں کے پاس اپنے آنے کی اطلاع بھیجی۔ وہ فوراً باہر آیا۔ بڑی عزت سے اندر لے جا کر کہنے لگا "آپ نے یہاں آنے کی

تکلیف کیوں اٹھائی کل میں خود ہی آپ کے پاس آنے والا تھا۔ میں نے کہا، "ایک تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں دوسرے مجھے آپ سے کچھ کہنا بھی ہے۔" وہ بولا صبح میں وہیں آؤنگا۔ تب باتیں ہونگی۔"

اپنے کہنے کے مطابق خان صبح آیا اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا اس کا تعارف کراتے ہوئے خان کہنے لگا۔ یہ ایک بڑے نامی ڈاکٹر ہیں میری غیر حاضری میں یہ آپ کا خیال رکھیں گے۔" ساتھ ہی پوچھا۔ "بہن! کیا تم یہاں سے باہر جانا پسند کروگی؟" میں نے انکار کیا۔ اس نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ پھر میں نے کہا "بھائی یہاں عورتوں پر بڑے ظلم ہو رہے ہیں۔ تم جیسے شریف آدمی کے ہوتے ہوئے یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے کامیابی نہیں مل سکتی تم لوگ بھگوان کو کیوں بھول رہے ہو؟ میں تمہاری قید میں ہوں۔ مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ہندوستان لڑے یا پاکستان جو ظلم کر گیا وہ گر جائیگا،" جواب دیا "اب میں نے عورتوں کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے۔" میں بولی "ٹھیک ہے۔ میں سارا دن بیٹھی رہتی ہوں۔ اگر تم مجھے ان دکھی عورتوں کی دیکھ بھال کا کام سونپ دو تو اچھا ہو" اس پر اس نے نہ نکرتے ہوئے کہا۔ یہ کام ابھی تم سے نہیں ہو سکتا؟"

ان دو کے علاوہ ایک تیسرا شخص بھی وہاں تھا۔ وہ اس وقت چپ چاپ ہماری باتیں سنتا رہا۔ لیکن دوسرے دن تنہا ہی مجھ سے ملنے کے لئے آیا اس نے باہر سے میرے نوکر کے ذریعہ مجھ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ میرے

بلانے پر وہ اندر آگیا۔ وہ لگ بھگ پچاس برس کا تھا۔ وہ معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا اور وہ "خاں" نام سے مشہور تھا۔ وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا میں ڈاکٹر کا ساتھی ہوں۔ ہم سب تمہاری کوٹھی میں ٹھہرے ہیں۔ "بہن!" وہاں میں نے ایک کمرے میں ہڈیوں کا کچھ چورا ٹین کے تختے کے نیچے دیکھا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارے مالک کا ہے۔ کیا تم اسے ندی میں ڈلوانا چاہتی ہو؟" میں نے کہا، "ڈلوانا تو چاہتی ہوں لیکن ندی پر کیسے جاؤں" مجبور ہوں" وہ بولا "اپنا نوکر میرے ساتھ دو۔ میں اس چھوٹے کو کرشن گنگا میں ڈلوا آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مہتا صاحب کی تعریفیں کرنے لگا۔ پھر میری ضروریات کے بارے میں پوچھا۔ اتنے میں مولوی بھی وہاں آگیا۔" اس سے وہ بولا سنو مولوی صاحب! یہ میری بہن ہے اس کی ہر طرح حفاظت کرنا۔ اگر اس کو کچھ تکلیف پہنچی تو تمہاری خیر نہیں۔" مجھ سے پوچھنے لگا۔" کیا تم رامائن پڑھتی ہو؟" میں نے کہا، "کبھی پڑھتی تھی۔ لیکن اب گیتا اور رامائن میرے پاس نہیں ہیں۔" اس پر مولوی نے کہا، "میرے پاس گیتا اردو میں ہے۔ میں وہ آپ کو پڑھنے کو دیدوں گا۔" خان نے کہا، "ہاں ضرور دینا۔" اس کے بعد مجھ سے پوچھنے لگا، "کیا قرآن شریف پڑھو گی؟" میں نے کہا اگر ہندی میں ہوگا تو ضرور پڑھوں گی۔ لیکن ڈر سے نہیں پڑھوں گی ایک ہندو کی حیثیت سے میرے لئے سب مذہبی کتابیں برابر ہیں۔ میں اس کی اتنی ہی عزت کروں گی جتنی اپنی مذہبی کتابوں کی کرتی ہوں۔" مولوی نے ہندی میں چھپا ہوا ایک سپارا اور اردو گیتا لا کر دی۔ خان کے کہنے پر اس نے کچھ اور کتابیں

بھی مجھے پڑھنے کو دیں جس میں عہد مغلیہ کی شہزادیوں کی کچھ درد ناک کہانیاں بھی تھیں۔ خان کچھ دیر بعد ادم کو دوسرے دن کوٹھی پہ آنے کو کہہ کر چلا گیا۔

میں مولوی کی بیوی سے ہمیشہ نرمی سے پیش آتی تھی۔ لیکن وہ میرے ساتھ کے تین مردوں سے تنگ تھی۔ مجھ سے کہتی تھی" ہمارے یہاں پردا ہوتا ہے میں کسی کے سامنے نہیں آتی۔ لیکن یہ تمہارے آدمی یہاں رہ رہے ہیں مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہاری وجہ سے چپ ہوں۔ تم انہیں رخصت کیوں نہیں کر دیتیں؟" میں اسے سمجھاتی "بہن! یہ میرے نوکر نہیں بچے ہیں۔ میں انھیں اپنے سے دور کر کے موت کے منہ میں نہیں ڈھکیل سکتی۔ جائیں گے تو ہم سب اکٹھے جائیں گے۔" ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔" یہ سن کر وہ ناک بھوں چڑھا کر رہ جاتی۔ لیکن جب کبھی لڑائی کے جہاز بم پھینکنے آتا تھا تو مولوی کی بیوی کو میری ضرورت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اس وقت خوف سے اس کا دل لرز اٹھتا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی۔ اور مجھے پکڑ لیتی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے مولوی کی لڑکیاں مجھ سے کہنے لگیں، "کیا تمہیں ہمارے ہاتھ کا کھانا کھانے میں پرہیز ہے؟ تم ہمارا پکا ہوا کھانا کیوں نہیں کھاتیں۔ میں نے کہا" تم جانتی ہو میں نے ایک ہی وقت صفائی سے کھانا کھانے کا برت رکھا ہے۔ تم لوگ گوشت وغیرہ کھاتے ہو اس لئے میں تمہارے یہاں نہیں کھاتی۔ اگر تم مٹی سے ہاتھ دھو کر صفائی سے کھانا پکاؤ تو میں ضرور کھاؤں گی۔ مجھے تم سے چھوت نہیں ہے۔ لڑکیوں نے میرے

دوسرے دن صبح خان خود آ کر اوم کو ساتھ لے گیا اور رہنا صاحب کے باقیماندہ پھول کرشن گنگا میں ڈلوا آیا۔ ندی کے کنارے اس نے اوم سے کہا "دیکھو، انھیں کنارے پر نہیں بلکہ درمیان میں ڈالنا تاکہ یہ بہہ جائیں۔ ایسا کرنے سے ماتاجی کے دل کو تسلی ہوگی ہمیں انھیں خوش رکھنا ہے"۔ اوم اور شیو دیال مجھے ماتاجی کہتے تھے اس لئے خاں مجھے بہن جی اور کبھی کبھی ماتاجی کہا کرتا تھا۔ وہ روزانہ گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتا رہتا۔ اس پر کئی ایک نے پاکستانی ہونے کا شک کیا اس کی باتوں اور اس کے لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہے۔ ہم اس کی باتوں سے تنگ بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی اس پر شک بھی ہوتا تھا کہ کہیں یہ دھوکا تو نہیں دے رہا۔ انسان کے اندر ہی تو تمام پاپ ہوتے ہیں۔ لیکن تنگ ہونے پر بھی میں نے اپنے ساتھ والوں سے یہی کہا۔ چاہے کچھ ہو اس نے مجھے بہن کہا ہے مجھے اس سے کچھ بھی ڈر نہیں"۔ ویسے شہر میں اس کی بڑی دھاک تھی۔

کبھی کبھی ڈاکٹر بھی ہمارے ہاں آتا تھا۔ شرمیتی موہی کی صحت ویسے تو اچھی تھی۔ لیکن گولی کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کرنے کے لئے ایک دوسرے ڈاکٹر کی جو پہلے کشمیری پنڈت تھا ڈیوٹی لگا دی تھی۔ یہ ریاستی فوج کا ڈاکٹر تھا۔ اور اب مسلمان بن گیا تھا۔ وہ ہر روز آتا اور پٹی کر کے چلا جاتا۔ میں نے اُسے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ آہیں بھرتا رہتا تھا۔ لیکن ہم سے اُس نے کبھی کوئی خاص بات نہیں کی۔ اُس کی ٹولی میں لگ بھگ دس آدمی تھے۔ اور وہ سب ہماری کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ میرے

پاس آتے رہتے تھے۔ اس سے مولوی کی بھی ان سے جان پہچان ہو گئی تھی۔ اور وہ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے آنے لگے تھے جمعے کے روز وہاں میٹنگیں بھی ہونے لگی تھیں۔ پاکستانی لیڈروں کی تقریریں عموماً وہیں ہوتی تھیں۔

کبھی کبھی ڈاکٹر اور خان محاذ پر دوڑی جاتے تھے۔ ان کی کوٹھی کے باہر ہمیشہ درختوں کے پتوں اور گھاس سے ڈھکی ایک لاری تیار رہتی تھی۔ ہوائی حملے سے بچاؤ کا یہ نرالا ڈھنگ نکالا گیا تھا۔

ایک دن میں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اور ان کے پانچ ساتھی آئے ان میں سے ایک پروفیسر مقبول قریشی بھی تھا۔ جو کچھ ہی دن پہلے سری نگر سے چھٹی پر آیا تھا۔ وہ رہنا صاحب کا کلاس فیلو رہا تھا۔ اور ہمارے ہاں بھی کئی بار آیا تھا۔ اُس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میں باہر نکلنا نہ چاہتی تھی لیکن وہ آنگن میں بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے ہم تو مل کر ہی جائیں گے۔ میں بڑی مشکل میں پڑی۔ کیونکہ مولوی کی بیوی اور لڑکیاں باہر نہ جا سکتی تھیں۔ میں انھیں اندر نہ بلا سکتی تھی۔ اس لئے میں ان کے اس طرح کے ہٹ پر غصے سے بھر گئی۔ جلدی سے باہر آئی اور گرج کر بولی "بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ مجھے کیوں تنگ کرتے ہو جب میری طبیعت ٹھیک نہیں تو میں تم سے کیسے بات چیت کر سکتی ہوں" میری غصہ بھری بات سن کر وہ بولے "معاف کرنا بہن جی! ہم تو آپ کی باتیں سن کر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اگر آپ کو تکلیف ہوتی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں لیکن وہ گئے نہیں میری تعلیم اور میرے خاندان کے متعلق پوچھنے لگے۔

ایک شخص میرے لڑکے سریش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:" مجھے ان بچوں پر ترس آتا ہے۔ بیچاروں کی پڑھائی برباد ہو گئی۔ اگر آپ اسے میرے پاس پڑھنے کے لئے بھیجیں تو میں اسے پڑھاؤں گا!" میں نے کہا،" آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن میری ایک عرض ہے کہ آپ مجھ پر، میری حالت پر، میرے ان بچوں پر ترس نہ کھائیں۔ مجھ پر رحم کرنے کا حق صرف بھگوان کو ہے انسان تو برباد کرنا جانتا ہے۔ آباد کرنا نہیں۔ آج تک اس نے لاکھوں انسانوں کی جان لی ہے۔ لیکن زندہ ایک کو بھی نہیں کر سکا۔ خیر! میں بہت کچھ کہہ گئی ہوں بُرا نہ مانیے۔" وہ اٹھے۔ کہنے لگے۔ معاف کرنا، جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گی تب آئیں گے۔"

بعد میں سنا گیا کہ یہ ٹولی گھر گھر میں گھوم کر لڑکیاں دیکھ رہی تھی

(۱۵)

شیطان ہمدرد کے رُوپ میں

مجھے کھانے پینے کی دقّت سے پیچش ہو گئی تھی۔ شیو دیال جا کر پٹھان ڈاکٹر کو بلا لایا۔ اس نے آتے ہی مجھے اچھی طرح دیکھا۔ اور شیو دیال کو

ساتھ لے کر فوراً بازار گیا۔ اور ایک مسلمان کی دوکان سے دوائی لے کر بھیجی وہ اکثر میرے پاس آتا تھا۔ بہت متعصب تھا۔ جب سے وہ مظفر آباد آیا تھا مسلمانوں میں یہی پرچار کرتا تھا کہ اس نے ہندوستان میں مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتے دیکھے ہیں۔ اور تو اور وہ مجھ سے بھی اکثر ایسی باتیں کرتا تھا۔ بیکس میں اُسے ڈانٹ دیتی تھی۔

ایک دن آنگن میں میں اس سے بات چیت کر رہی تھی۔ کہ اوپر سے لڑائی کا جہاز آ گیا۔ وہ بھاگ کر درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا ڈاکٹر صاحب! آپ اندر چھُپ جائیے کہیں آپ پر ہی وار نہ ہو۔ جنتا کو آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ جھینپتے ہوئے درخت کی اوٹ سے نکل کر میرے پاس آیا۔ اور کہنے لگا:" نہیں" ہم نہیں ڈرتے۔ میں تو یونہی درخت کے نیچے چلا گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مسجد میں تقریر کرتے ہوئے۔ اس نے کہا تھا۔ جنتا صاحب کی بیوی نے مجھ سے چھپنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ پٹھان چھپنے والے نہیں۔"

ان دنوں کشمیر کی حکومت کے دو افسر یہاں بھاگ کر آئے تھے۔ عاشق حسین اور میاں ناصر۔ دونوں کشمیری مسلمان تھے۔ یہاں آتے ہی پہلے کو وزیر اور دوسرے کو پولیس کپتان کے عہدے ملے دونوں میرے پاس آئے اور اچھی طرح بات چیت کرنے کے بعد بولے کوئی تکلیف ہو تو ہم سے کہنا ہم آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔" یہ بھی کہا:" ہم آپ کے لئے اسپیشل راشن کا انتظام کر دیں گے؟" میں نے کہا،" ابھی میرے پاس

راشن ہے۔ جب ختم ہو جائیگا تب آپ سے لینا ہی پڑے گا۔

اس عرصہ میں رحم داد خاں تبدیل ہو کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ ادھر مولوی کو بھی نوکری مل گئی تھی۔ اُسے کنٹرولر کا عہدہ ملا۔ مجھ سے ملنے کے لئے کافی لوگ آنے لگے تھے۔ میں بہت عاجز آ جاتی تھی۔ لیکن کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ایک دن ایک ستر برس کا پٹھان آیا۔ دیکھنے میں بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا "میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پھر کبھی آؤں گا" پھر بولا "ہم سے کوئی پوچھتا ہے کیسے آئے ہو تم۔ ہم کہتے ہیں ایسے ہی دیکھنے سننے کے لئے۔ اپنے پاس سے کھاتے ہیں۔ کسی کی چیز کو چھوتے نہیں۔ خود ہی یہ بھی بتانے لگا۔ میں بہت سالوں تک ہندوستان میں رہا ہوں۔ آنند بھون بھی جاتا تھا۔ وہاں اکثر ہمیں ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ مٹھائی ملتی تھی۔ دیکھو آج یہ کیا ہو رہا ہے" میں نے کہا "یہ سب ہماری حماقت ہے بدلے کی آگ سے جلے ہوئے ہم سکون کو کھو بیٹھے ہیں۔ انسان حیوان بن گیا ہے" وہ پھر مجھ سے کہنے لگا "تم سب کے سامنے کیوں آ جاتی ہو" یہ اچھا نہیں تمہیں اپنے بچوں کا دھیان رکھنا چاہیئے"۔ میں نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا "مجھے بھگوان کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہے۔ موت کا تو ہم خوشی خوشی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ سُن کر وہ چپ ہو گیا۔ اور پھر آنے کو کہہ کر چلا گیا۔

ایک بار آزاد کشمیر سرکار کا حاکم سردار ابراہیم وہاں آیا۔ مسجد میں اس کی تقریر ہوئی۔ وہ میرے پاس بھی آیا۔ اس کے ساتھ خان اور ایک جموں

کا وکیل دُرّانی تھا۔ یہ وکیل مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی بہن میری گہری سہیلی تھی۔ سردار بھی مہتا صاحب کو جانتا تھا۔ جن دنوں وہ پونچھ میں گورنر تھے۔ تو سردار وہاں وکالت کرتا تھا۔ مجھ سے وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اُسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسی کے اشارے پر اتنے مظالم ہوئے ہیں۔ کہنے لگا "آپ پر آج تک جو کچھ گذر رہی ہے اس کے لئے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مہتا صاحب کی موت کا مجھے افسوس ہے۔ میں نے کہا سردار مجھ سے کس بات کی معافی مانگتے ہیں؟" معافی بھگوان سے مانگئے۔ اور سردار صاحب! کیا عورتوں اور بچوں پر ظلم کر کے کوئی کامیاب ہوا ہے؟ آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ کیا کہیں تاریخ میں آپ نے پڑھا ہے کہ ظلم کرنے والی قومیں ہمیشہ فتحمند رہی ہیں؟ یاد رکھئے بھگوان کے ہاتھ میں انصاف کا ترازو ہے۔ جس طرف ظلم زیادہ ہوگا وہ ضرور گر جائیگا۔ وہ چاہے ہندوستان ہو یا پاکستان" وہ بولا "نہیں ہم ایسا نہیں کرتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم میں اور سکھوں میں فرق ہی کیا رہا؟" میں نے پوچھا! پھر یہ سب کس نے کیا؟ کیا آپ پر دھان نہیں ہیں، خاں درمیان میں بات کاٹ کر بولا "ہم کشمیر کو کبھی نہیں چھوڑیں گے"۔ ان دونوں کی آپس میں کچھ باتوں پر بحث سی ہوئی۔ جسے میں نہ سمجھ سکی۔ اس کے بعد سردار نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ اگر یہ عورتیں ہندوستان جانا چاہیں تو انھیں جلدی بھیج دوں"۔ میں نے فوراً جواب دیا "سب جانا چاہیں گی۔ آپ کہیں تو میں سب کی درخواست لے کر بھیج دوں" وہ بولا "یوں تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ میں لاہور جا کر ریڈیو پر کہہ دوں گا

بعد میں آپ کو بھیجا جائیگا۔ ابھی آپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے؟" ترمیتی مو؛ی سے بھی پوچھا۔ میں نے کہا، "مجھے عزّت کی موت چاہیئے اور کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیئے اب جینا دوبھر ہو گیا ہے۔" وہ کہنے لگا "میں نے تو آپ کی ہمت کی بہت تعریف سنی ہے۔ آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اب ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے؟" میں نے جواب دیا "سخت سے سخت انقلاب سے بھی میں نہیں ڈرتی۔ لیکن یہ اس طرح کب تک چلے گا۔ مفت کا کھانا پینا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔" اس پر سردار مجھ سے کچھ نہ کہہ کر مولوی سے کہنے لگا۔ "آپ نے انہیں رکھ کر بڑی اچھی بات کی ہے۔" پھر مجھ سے بولا "آپ کو کس کس چیز کی ضرورت ہے بولئے؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی خان بولا "ان کے پاس ہے ہی کیا؟ بچوں کو دیکھئے پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ کھانے کو آٹے کے علاوہ کچھ نہیں۔ کپڑے دھونے کے لئے صابن نہیں۔ پھر بھی یہ آپ سے کچھ نہیں مانگیں گی۔" سردار کہنے لگا۔ "میں سب ٹھیک کرا دوں گا۔ آپ کو کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ سب چلے گئے۔

کچھ دن بعد سردار نے چار جوڑے کپڑے بھجوائے جن میں سے کچھ پرانے بھی تھے۔ بعد میں سُنا کہ لانے والے نے انھیں راستے میں بدل دیا تھا۔ کچھ صابن بھی بھیجا تھا اور وزیر کو راشن وغیرہ کی بھی ہدایت دے گیا تھا۔ میں نے کپڑے رکھ لئے۔

ایک دن جنگلات کا پہلے کا ایک انجنیر میرے پاس آیا۔ وہ پہلے حکومت کشمیر کا ملازم تھا۔ آجکل آزادانہ طور پر کام کرتا تھا۔ شاید سیالکوٹ

کا رہنے والا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "آپ کے شوہر جب کشمیر میں تھے۔ تب میں آپ کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کے شوہر میرے دوست تھے اس رشتے سے میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ یہاں نہ رہیں میں آپ کو راولپنڈی پہنچا دوں گا۔ اور وہاں سے جموّں جانیکا انتظام ہو سکتا ہے۔ اور لوگ بھی چلنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں۔ یہاں غلہ لے کر دس لاریاں آئی ہیں اور اب خالی جا رہی ہیں۔" میں نے کہا "میں سوچ کر جواب دوں گی۔" اس نے کہا، "اچھا میں ہسپتال کے کوارٹر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہیں پتہ بھیجنا" وہ چلا گیا۔ ہم لوگوں نے اس بارے میں مشورہ کیا اور نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اچھا ہی ہُوا۔ ورنہ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا انھوں نے ہمیں ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مولوی کے گھر میں رہتے ہوئے اب مجھے دو مہینے گذر گئے تھے۔ وہ لوگ عاجز آ گئے تھے۔ لیکن خان اور افسروں کے خوف سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے چمن لال سے، جو ہمارے یہاں آیا کرتا تھا، مولوی کو بڑی چڑ تھی۔ کہتا تھا؛ "یہ کانگریسی ہے اور بڑا چالاک ہے،" چمن ہمیں فوج کے آگے بڑھنے کی خبریں سنایا کرتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر اپنے ساتھ ایک پٹھان کو لے آیا۔ وہ لگ بھگ ۴۵ پینتالیس برس کا تھا۔ اس کا قد لمبا اور لباس معمولی تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "یہ جوہری ہیں۔ بمبئی میں ان کی دوکان ہے۔ یہ پنڈت نہرو کے بھی دوست ہیں۔ آپ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ میرے پاس اس وقت شریمتی اسو دی

تین ساتھی اور بڑا لڑکا سریش تھا۔ وہ سریش کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "یہ آپ کا لڑکا ہے؟ کیا آپ اسے مجھے دیں گی۔ میں نے شادی نہیں کی ہے میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میں بولی "میری دُنیا اب اتنی ہی ہے۔ کیا اب اسے بھی تم مانگ رہے ہو؟" ڈاکٹر نے ٹوک کر کہا "نہیں یونہی کہہ رہے ہیں" اس نے پھر مجھ سے میرا نام پوچھا۔ اور میرے بتانے پر کہا "میں تمہاری قسمت دیکھنا چاہتا ہوں"۔ میں بولی "کیا دیکھیں گے آپ؟ مجھے تو سب کچھ نظر آرہا ہے"۔ ڈاکٹر کہنے لگا۔ "بڑے جیوتشی ہیں"۔ جیوتشی صاحب نے کچھ سوچنے کی سی صورت بناکر کہا۔ تمہارے سُکھ کے دن ختم ہوچکے ہیں" میں نے کہا "یہ تو سب کو نظر آرہا ہے" وہ بولا۔ لیکن تم چاہو تو اب بھی اپنی زندگی کو سُکھی بنا سکتی ہو۔ تم میں ایک بُری عادت ہے اسے چھوڑ دو۔ تم کسی کا یقین نہیں کرتیں۔ اگر تمہیں کوئی اچھا دوست ملے تو اس کی بات مان لو۔ تبھی تمہارے دن پھریں گے ورنہ تم پر بہت مصیبتیں آئیں گی۔ تمہارے بچے دھول میں مل جائیں گے۔ تم اندھی ہوجاؤ گی"۔ میں نے جواب دیا؟ اگر سچائی پر قائم رہتے ہوئے اس بھگوان کی یاد میں میری آنکھیں جاتی رہتی ہیں تو خوشی سے میں اسے برداشت کرلوں گی۔ اس پر اس نے کہا ایک بات میں آپ سے اور کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن سب کے سامنے نہیں"۔ میں بولی "آپ تنہائی میں کہہ سکتے ہیں۔ اسی آنگن میں تھوڑی دوری پر ایک تخت تھا۔ میں نے وہیں چلنے کو کہا۔ بھگوان کا نام لے کر اور اپنے مرحوم شوہر کی یاد کرکے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ شریمتی مودی نے مجھے دوکا۔ "کرشنا کیا کر رہی ہو مت جاؤ۔ میرے تینوں ساتھیوں کا بھی رنگ

اڑ گیا۔ میں نے انھیں دلاسے دیکر کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے اس کی بات سُننا ہوگی۔

وہاں اس نے مجھ سے کہا "میرا بھانجا ہندوستان میں پھنسا ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو تاکہ میں تمہارے بدلے میں اسے حاصل کرسکوں۔ اور بھی ایک آدھ بے مطلب سی بات اس نے کہی"۔ میں اس کی نبض کو پہلے ہی پہچان گئی تھی۔ پھر بھی نرمی سے بولی "سنو تم مجھے اپنا پتہ دے جاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب میں ہندوستان جاؤں گی تو تمہارے بچے کو کھوج کر ضرور بھجوا دوں گی" وہ اپنی ہی ہانکتا گیا "دیکھئے میں آپ کو پنڈت جی کے پاس لیجاؤں گا" میں نے کہا "میں ہندوستان جاؤں گی تو خود پنڈت جی سے ملوں گی۔ آپ کے لڑکے کے لئے ضرور کوشش کرونگی۔ لیکن اب تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں اسی حال میں خوش ہوں"۔ یہ سُن کر اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور جلدی سے اپنا پتہ دیکر چلنے کو اٹھا۔ جاتے جاتے پہلے تو اس نے نرمی سے کہا "کوئی تکلیف ہو تو مجھے خط لکھنا" پھر ایک دم رُخ بدل کر دھمکی بھرے لہجے میں کہنے لگا "تم نے میرے دل کو دُکھایا ہے آج پٹھان کا راج ہے — دیکھا جائیگا" میں نے کہا جس کا مجھے بھروسہ ہے وہی مجھے ہر حال میں بچائیگا۔ وہ تم سے کہیں بڑا ہے۔ یہ سُن کر اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ وہ چاہتا تو بازو پکڑ کر مجھے زبردستی لیجا سکتا تھا باتیں بنانے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ لیکن میرے بھگوان نے مشکل کے وقت دروپدی کے چیر نہیں بڑھائے تھے؟

بات ختم ہوئی ساتھ کا ڈاکٹر جسے میں آج تک شریف سمجھتی رہی تھی، بولا۔ "ہمیں اب اجازت دیجیے،" نقلی جیوتشی بھی بولا "ہمشیرہ! میں جاتا ہوں۔" جاتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ماتھے پر لگایا۔ میری سمجھ میں یہ پہیلی نہ آسکی۔ دوسرے دن خان آیا کہنے لگا، "بہن میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اب کسی غیر کے سامنے نہ آنا۔ وعدہ کرو کہ نہیں آؤں گی۔" میں نے کہا مجھے منظور ہے "آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" خان چلا گیا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی تین قبائلی آئے۔ میں اندر تھی۔ شیو دیال اور اوم سے، جو باہر تھے پوچھنے لگے "وہ کہاں ہے؟" اوم نے کہا "اندر ہیں۔" انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اوم سے انھیں انکار کہلا بھیجا۔ وہ کہنے لگے تو پھر ہم اندر آئیں گے۔ میں نے کہلا بھیجا۔ گھر میرا نہیں ہے جن کا ہے اُن سے اجازت لے لو۔ وہ بولے، "چاہے کچھ بھی ہو تمہیں آنا ہی پڑے گا۔" ایک گھنٹہ تک یہی بحث چلی۔ آخر وہ ناامید ہو کر لوٹ گئے۔

۱۶

جہنم یا جنت

اب ہر روز فوج ہماری کوٹھی میں آتی۔ پہاڑ کے دامن میں ٹھہرتی اور رات کو محاذ پر چلی جاتی۔ ایک بار رات کو دس بجے ہم اپنی دکھ بیتی پر مل جل کر باتیں کر رہے تھے، کہ مولوی کی دونوں لڑکیاں میری لڑکیوں سے کہنے لگیں۔ "آؤ باہر گانا سنیں۔" وہ چلی گئیں۔ میری عقل اُس وقت جیسے گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا تک نہیں کہ گانا کہاں سے؟ بات یہ تھی کہ کوٹھی میں تین سو کے قریب سپاہی اترے ہوئے تھے۔ . . اوڑی کے محاذ پر جا رہے تھے۔ رات کو کھا پی کر وہی لوگ گا رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو سب لڑکیاں دیوار کی آڑ میں کھڑی ہو کر گانا سنتی رہیں۔ پھر پاس کے کھیت میں ضروری حاجتوں سے فارغ ہونے کے لئے چلی گئیں۔ ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ جس طرف وینا تھی اسی طرف سے پٹھان آنکلے۔ وہ انھیں گھیرے میں لیا ہی چاہتے تھے کہ وینا نے کہا "وہ دیکھو! پٹھان آگئے" وہ سب ہی آنکھ کے جھپکے میں گھر آگئیں۔ مولوی کی چھوٹی لڑکیاں بھی آگئیں

لیکن بڑی کو ایک پٹھان نے بازو سے پکڑ لیا۔ یہ لڑکی سب سے پہلے بھاگ سکتی تھی کیونکہ وہ گھر کے سب سے زیادہ نزدیک تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ سہم سی گئی تھی۔ ان سے کہنے لگی۔ میں مسلمان کی لڑکی ہوں — چھوڑ دو۔ پھر کلمہ بھی پڑھا لیکن وہ نہ مانے کہنے لگے ”تم کافر کی لڑکی ہو“ اتنے میں اُس کا بھائی آیا۔ پاس ہی چچا بھی رہتا تھا وہ بھی آ پہنچا۔ ان کے کہنے پر بھی وہ نہ مانے تب اُس کا بھائی مسجد میں سے باپ کو بلا لایا۔ مولوی نے کہا ”یہ میری لڑکی ہے“ تب کہیں اس بیچاری کو چھٹی ملی۔ وہ لڑکی اندر آئی تو اس کی ماں سر پیٹنے اور رونے لگی۔ روتے روتے وہ اپنے شوہر کو گالیاں سنا رہی تھی، اور کہہ رہی تھی تو نے ہندوؤں کو اپنے گھر رکھا ہے تبھی میری لڑکی پر مصیبت آئی ہے۔ میں بھی سوچ رہی تھی ہماری ہی وجہ سے اسے یہ تکلیف اٹھانی پڑی ہے اگر کہیں وہ اُسے لے جاتے تو کیا ہوتا؟ مجھے تو وہ بھی اپنی لڑکی کی طرح لگتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ سچ ہے بہن، ہماری وجہ سے ہی تمہیں یہ سب تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ کوئی اور جگہ ملنے پر ہم ایک دو دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ بھگوان کا شکریہ ادا کرو جس نے اس وقت تمہاری لڑکی کو بچایا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی میں نے خان کو بلا کر کہا ”میں کوئی اور مکان لینا چاہتی ہوں۔ وزیرے سے بھی کہا۔ لیکن کوئی بھی دل سے یہ نہ چاہتا تھا کہ میں وہاں سے جاؤں لیکن میں ایک منٹ بھی وہاں نہ رہنا چاہتی تھی۔۔ ادھر مولوی بھی اب گھنٹوں ڈاکٹر کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے شک ہونے

لگا۔ کہ کہیں ہمارے ساتھ یہاں کوئی دھوکہ نہ کیا جائے۔ اسی بیچ میں ایک دن پروفیسر مقبول وہاں آیا۔ وہ اب وہاں کا کوئی افسر بن گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا ”شریمتی مہتا! تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس ہمارا پریذیڈنٹ (ابراہیم) چل کر آیا۔ میں نے پوچھا اس میں خوش قسمتی کی کیا بات ہے؟ وہ بولا ”تم اپنا مقابلہ ان مسلمان بہنوں سے کرو جن کے ہندوستان میں ننگے جلوس نکالے گئے تھے۔ کیا یہاں کسی نے تمہارا جلوس نکالا۔ میں نے کہا ”پروفیسر صاحب! مجھے ان بہنوں کی حالت پر دکھ ہے اگر میرے جلوس نکالنے سے ان بہنوں کے دکھ دور ہو سکتے ہیں — تو میں تیار ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو مٹی سمجھ لیا ہے۔ ان باتوں کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ وہ ایکدم بولا ”آپ نے برا مانا۔ میں نے یوں ہی بات کی تھی۔ کیا ہم آپ کی اس دن کی نیکی بھول سکتے ہیں جب آپ اپنی لڑکیوں کے ساتھ ہمیں بچانے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ وہ رات کتنی خوفناک تھی۔ میں بھی یہاں سے چلا گیا تھا اور اپنی ماں کو تمہارے حوالے کر گیا تھا۔ میں نے کہا ”وہ تو میرا فرض تھا جو مجھ میں کر سکتی تھی وہ مجھے کرنا ہی تھا۔ میں بدلہ نہیں مانگتی۔ آپ لینا چاہیں تو میں تیار ہوں۔ مجھے معاف کریں۔ میں نے تو معمولی سی بات کہی تھی وہ حلیمی سے بولا۔

ایک دن مولوی نے آ کر کہا میں آپ کے رہنے کا انتظام راولپنڈی میں کر رہا ہوں جب تک حالات ٹھیک نہ ہوں گے آپ وہاں آرام سے رہ سکیں گی۔ میں نے کہا ”میں اور کہیں نہیں جاؤں گی۔ ہاں میں نے اس مکان سے دوسری جگہ جانے کا انتظام کر لیا ہے میں چمن لال کے گھر جا کر رہوں گی۔

یہ سن کر اس کا منہ پھول گیا۔

خان نے کہہ رکھا تھا کہ جب مکان بدلو مجھے ساتھ لے لینا۔ بدمعاش گھومتے ہیں کہیں تنگ نہ کریں۔ لیکن میں نے اسے بھی نہیں بلایا۔ شام کے وقت کچھ کچھ اندھیرا ہونے پر سب سے پہلے میں نے لڑکیوں کو چمن کے گھر بھیجدیا۔ اس کے بعد ہم سب وہاں گئے۔ اس نے ایک اچھا صاف ستھرا ہمیں کمرہ دیا۔ اس کا مکان دنگے میں جلایا نہیں گیا تھا۔ صرف لوٹا گیا تھا۔ انہوں نے اس مکان میں کئی لڑکیاں چھپا رکھی تھیں اس میں کئی تہہ خانے تھے دن میں وہ لڑکیاں وہیں گھاس میں دبکی پڑی رہتی تھیں۔ اس چھوٹے مکان میں لگ بھگ سات ڈیرے لگے ہوئے تھے حالت سب کی قابل رحم تھی۔ ٹوٹے ہوئے برتن ایک آدھ رضائی اور کچھ بوریاں جنہیں جوڑ سی کر انہوں نے بچھونا بنا لیا تھا۔ یہی اس ڈیرے کا بچا کھچا مال اسباب تھا۔ چمن لال کا خاندان سات افراد پر مشتمل تھا۔ ماں باپ ایک شادی شدہ بہن اس کا خاوند اور ایک بچہ اور ایک سترہ سالہ کنواری بہن اس کے علاوہ دوستو کے بیوی بچے بھی تھے۔

یہاں آ کر میں نے کسی کو دولت کے لئے اور کسی کو آدمیوں کے لئے روتے ہوئے پایا۔ مکان شہر کے بیچ میں تھا۔ اس لئے قبائلیوں کا خوف بھی برابر بنا رہتا تھا۔ وہ بے رحم موقع بے موقع آتے اور جو کچھ ملتا لوٹ کر لیجاتے۔ چمن لال کا باپ نانک چند عرائض نویس کبھی اچھا دولت مند تھا لیکن اب مصیبت کا مارا بیچارا۔ دانے دانے کو ترستا تھا۔ ہاں رسوخ

اچھا ہونے کی وجہ سے مقامی مسلمان کبھی کبھی تھوڑی سی مدد کر دیتے تھے۔ دراصل وہ زندگی زندگی نہیں تھی۔ موت کا امتحان تھا۔ کئی ڈیرے ایک ساتھ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو ڈھارس رہتی تھی۔ ٹٹی گھر کے اندر نہیں تھی۔ اس لئے سب کو باہر جانا پڑتا تھا۔ قبائلیوں کے خوف سے بہت سویرے جاتے تھے اس وقت جلے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات سے بھی خوف لگتا تھا۔

یہ دسمبر کے دن تھے ٹھٹھرا نے والی سردی پڑ رہی تھی لیکن ہمارے پاس نہ پہننے کو کپڑے تھے نہ تاپنے کو آگ جلے ہوئے گھروں سے تختے لا لا کر کسی طرح چائے وغیرہ پکاتے تھے مولوی کے گھر پر اپنی کوٹھی کے جنگلے کے تختے لا لا کر ہم جلاتے تھے۔ بلکہ اسی کی راکھ سے میں کپڑے بھی دھو لیتی تھی۔ لیکن یہاں پر نہ تو لکڑی ہی تھی اور نہ راکھ نتیجے کے طور پر لوگوں کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ کئی ایک کے جسم پر جوئیں اس طرح رینگتی تھیں گویا چینونٹیاں اپنے بلوں سے نکل کر مارچ کر رہی ہوں۔ میرے دونوں لڑکوں کے سارے بدن پر بھی پھنسیاں نکل آئیں امیر گھرانے کے بچے چھابڑی فروش بن کر دو تین آنے روز کما لیتے تھے مسلمان تو کوئی ان سے خریدتا نہ تھا۔ ہاں ایک آدھ آتا جاتا ہندو خرید لے تو بس خرید لے۔ آس پاس کے بچے ہوئے مکانوں میں سب شرنارتھی ہی تھے۔ وہ بوریوں اور چیتھڑوں سے اپنے تن کو ڈھکے رکھتے تھے۔ کچھ دن بعد پاکستانیوں نے راشن کا کچھ انتظام کیا۔ کئی مسلمانوں کی

کی زبانی یہ بھی سننے میں آیا کہ اب ہندو ہمارے دوست ہیں۔ انہیں ستایا نہ جائے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں تھیں

ہمارے مکان کے پاس ایک گردوارہ تھا۔ وہاں ان گنت بیوائیں رہتی تھیں جن میں سے قبائلی اور سپاہی چن چن کر اچھی عورتیں لے جاتے تھے۔ وزیر نے ان کی حفاظت کے لئے اگرچہ کئی پہرے دار مقرر کر رکھے تھے لیکن اس اندھیر نگری میں کون ان کی پرواہ کرتا تھا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ باقاعدہ حکومت قائم ہونے پر بھی یہ غنڈہ گردی برابر جاری رہی۔

ہمیں یہاں آئے دو دن بیتے تھے کہ خان آیا۔ بولا "میں نے تمھیں بہن سمجھا تھا لیکن تمھیں مجھ پر بھی شک ہے۔ جو تم یہاں چوری چوری چلی آئیں۔ اتنا فرق؟ پھر بھی میں تمھیں بہن کہہ چکا ہوں۔ اس لئے عزت کرتا ہوں۔ جب تک میں یہاں ہوں جان دے کر بھی تمھیں بچاؤں گا" میں نے مجرم کی حیثیت سے کہا "بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو میں اپنی غلطی مانتی ہوں" اتنا کہہ کر میں نے چاقو کی نوک سے اپنی انگلی سے خون نکالا اور اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ پھر سوت کا دھاگہ لے کر اس کے ہاتھ میں راکھی باندھی اور تب اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سنو بہن میرے قبیلے میں دو سو آدمی ہیں۔ کوئی تمھیں بہن کہے گا کوئی پھوپھی اور کوئی ماسی۔ جہاں تک ہو گا تمھیں بچائیں گے۔ تمھاری حفاظت ہماری حفاظت ہو گی۔ تمھیں اب اپنا بوجھ مجھ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمھارا مال کس نے لوٹا ہے؟ میں وہ سب لا دوں گا!"

"مجھے معلوم ہے کہ میرا سامان کس نے لوٹا ہے لیکن میں نے اپنی چیزیں واپس

نہ لینے کا عہد کر لیا ہے۔ میں پھٹے حال میں گذر کروں گی لیکن چیزیں نہ لوں گی جب میں اپنے ہیرے (شوہر) کو واپس نہ پا سکی تو ان کانچ کے ٹکڑوں کو واپس لے کر کیا کروں گی" یہ کہتے کہتے میں نے اسے شروع سے آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔ جب میں کسی کو کان کا زیور دینے کی بات سنا رہی تھی تب وہ بولا "بتاؤ وہ کسے دیا تھا" میں نے کہا "میں نہیں بتا سکتی" اس نے ہاتھ کی چھڑی سے چھرا کھینچ کر کہا "دیکھو میرے پاس یہ ہے۔ پٹھان کسی کو مارنا گناہ نہیں سمجھتا۔ تمھیں بتانا ہو گا" میں نے گردن سامنے جھکا دی۔ اس نے چھرا واپس گپتی میں ڈال دیا اور کہا "مت بتاؤ میں سمجھ لوں گا" نیچے جا کر اس نے نانک چند سے کہا "تم نے میری بہن کو پناہ دی ہے اور تمھارے لڑکے نے جیل میں اس کی جان بچائی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں پر ابھی بہت کچھ ہو گا۔ ہاں تم بتاؤ، تمھارے پاس سنا ہے پستول ہے۔ وہ نکال کر مجھے دے دو اور کچھ گہنے بھی ہیں وہ بھی دے دو" اس نے جواب دیا "خان! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے سب کچھ لوٹ لیا گیا ہے ہم تو در در بھٹک کر دس دن بعد اس خالی مکان میں آتے ہیں۔ تم چاہو تو تلاشی لے سکتے ہو" اس نے کہا "مولوی تمھارے لڑکے کے کانگریسی ہونے کی شکایت کرتا ہے لیکن میں اب سمجھ گیا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور جب تک وہ وہاں رہا برابر ہر طرح سے ہماری مدد کرتا رہا۔

(۱۷)

کچھ اور واقعات

تینوں لڑکیوں کے لئے تو کپڑے مل گئے تھے باقی بچوں کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ان کو ننگا دیکھ کر میں نے زین کے اس ٹکڑے کے کپڑے سلانے کا فیصلہ کیا جو میرے شوہر نے بش شرٹ سلوانے کے لئے درزی کو دیا تھا اور جسے میں نے اس سے لے کر دان دینے کو رکھ چھوڑا تھا۔ خان نے ایک درزی کو بلا بھیجا۔ وہ دونوں لڑکوں کی شلواریں کاٹنے لگا۔ ان دنوں پٹھانوں کے خوف سے وہاں ہر کوئی شلواریں پہنتا تھا۔ میں نے درزی کو روک کر کہا "میں نقلی مسلمان نہیں بنوں گی اور نہ بچوں کو بننے دوں گی۔ تم ہندو ڈھنگ کے پاجامے بناؤ" اس نے ایسا ہی کیا۔ ان کپڑوں کی سلائی خان نے اپنے پاس سے دی۔

ایک دن خان نے مجھے اداس دیکھ کر پوچھا "کیا تمھیں اپنے مالک کی یاد آتی ہے، بڑی سرکار؟" وہ کبھی کبھی مجھے بڑی سرکار کہہ کر پکارا کرتا تھا اور جب باہر سے آتا تو کہتا "بڑی سرکار! آداب عرض" میں نے کہا "ہاں کبھی کبھی یہ دھیان آتا ہے کہ نشانی کے طور پر ان کا ایک کپڑا تک میرے پاس نہیں رہا" یہ سن کر وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد دھوبی سے میرے شوہر کی ایک پرانی قمیض لے آیا۔

میں نے بہت خوش ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا اور "اب میں اسے سنبھال کر رکھوں گی۔ جب یہ لڑکے اپنے باپ کے برابر ہوں گے تو اسے انہیں پہنا کر کہوں گی کہ اپنے پتا کی قربانی کو یاد رکھتے ہوئے تم ہمیشہ سچائی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

ایک دن خان میرے کان کا زیور لے آیا۔ نہ جانے اس نے کیسے اس کا پتہ لگا لیا تھا۔ آتے ہی اس نے چمن کی ماں کو میرے کمرے میں بلا کر کہا "تم میری بہن کو سمجھاؤ کہ اسے واپس لے لے۔ میں نے اسے بہن کہا ہے۔ میں اس کی چیز دوسرے کے پاس نہیں دیکھ سکتا" مجھے اس کا جذبہ اچھا تو لگا لیکن میں اس کی بات کیسے مان سکتی تھی۔ میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا "ہم اس وقت دانے دانے کو محتاج ہیں لیکن میں پیسے کے لالچ میں اپنے وچن کو جھوٹا نہیں کر سکتی۔ اگر تم مجھے بہن سمجھتے ہو تو یہ اسی کو واپس دے دو جس سے لائے ہو اور وعدہ کرو کہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤ گے" میں نے دیکھا کہ خان کو غصہ آ رہا تھا لیکن اس نے نرم ہو کر یہی کہا "وعدہ کرتا ہوں بہن! کہ اسے میں ابھی اسے واپس کر دوں گا"

انہیں دنوں کسی نے ایک دن شریمتی مودی سے کہا کہ تمھارے خاوند کی لاش ایک نالے میں پڑی ہے۔ ہمارے تینوں ساتھی اور چمن اس کی تلاش میں نکلے۔ بہت ڈھونڈنے کے بعد وہ سچ مچ ایک نالے میں پائی گئی۔ تب میں نے شریمتی مودی سے کہا "ہمیں اس کے کریا کرم کا انتظام کرنا چاہیئے۔ میں وزیر کو لکڑی کے لئے لکھتی ہوں۔ دیکھوں تو وہ کتنے پانی میں ہے اور اس کی نیت کیا ہے" سب لوگوں نے مجھ سے کہا "ایسا مت کرو۔ کہیں کوئی مصیبت نہ آجائے؟"

بھلا پاکستان میں کریاکرم کون کرنے دے گا؟" میں نے جواب دیا "چاہیے ہم کریاکرم کریں یا نہ کریں لیکن میں وزیر کی نیت جاننا چاہتی ہوں" میں نے وزیر کو لکھا اور اس نے پانچ من لکڑی کے لئے منظوری دے دی۔ لیکن منظوری لینے کے بعد بھی کسی میں کریاکرم کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں شریمتی مودی، چمن کی ماں، تینوں ساتھی اور چمن لال اس جگہ گئے جہاں لاش پڑی تھی۔ پاس ہی گنگا بہہ رہی تھی۔ چاروں مرد لاش کو اٹھا کر ہمارے پاس لائے۔ اسے ایک ٹین کے تختے پر رکھتے دیکھ کر شریمتی مودی بلک بلک کر رونے لگی۔ اگرچہ قتل کئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے لیکن لاش بالکل تازہ معلوم ہوتی تھی۔ اس میں سے نہ تو کسی طرح کی بدبو آ رہی تھی اور نہ ہی تن پر کا گوشت سڑا گلا تھا۔ بنیان اسی طرح موجود تھی۔ کوٹ اور قمیض اسی طرح پہنا ہوا تھا۔ کہیں کوئی فرق نہ تھا۔ صرف ایک طرف ایک زخم تھا۔ چہرے پر مکمل سکون تھا۔

اب سوال تھا کفن کا۔ شریمتی مودی نے ایک دھوتی نکالی جو انہوں نے دھوبی کے یہاں سے منگوا کر شوہر کی نشانی کے طور پر رکھی تھی۔ انہوں نے اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑے کو لاش کے اوپر ڈال دیا۔ دوسرا اپنے پاس رکھا۔ پھر ہم نے لاش کو جل کی نذر کر دیا۔ بعد میں شری مودی کی موت کا حال اس طرح سنا گیا کہ جب حملہ آور ان کی کوٹھی کے پاس پہنچے تو وہ ان کی بیوی، دو نوکر اور کملا گھر سے شہر کی طرف چل دئے لیکن ان کا لڑکا گھر میں ہی رہ گیا۔ اس کی عمر اکیس برس کی تھی۔ وہ وہیں چھت پر چڑھ کر بندوق سے دشمنوں پر وار کر رہا تھا ان کی کوٹھی شہر سے نیچی تھی۔ اس میں کچھ دور زینہ چڑھ کر شہر میں جانا پڑتا

تھا۔ زینہ چڑھتے وقت صرف ایک نوکر کو چھوڑ باقی سب کے گولی لگی۔ جیسے تیسے وہ لوگ شہر کے ایک نامی آدمی کے گھر پہنچے۔ وہ ہندو تھا۔ اس کا مکان کافی بڑا تھا اور وہاں پر سینکڑوں خاندان خطرے سے بچنے کے لئے آئے ہوئے تھے وہاں پہنچ کر شری مودی نے سب کو بٹھایا اور خود ہاتھ میں بندوق لے کر چل دیئے۔ مظفر آباد میں ماکڑی نام کی ایک جگہ ہے جہاں پر ان کا ایک مسلمان دشمن رہتا تھا۔ اس کا سر ترک بنانے کا کوئی بل انہوں نے پاس نہ کیا تھا۔ موت انہیں دھکیل کر وہیں لے گئی۔ جب ان لوگوں نے انہیں دیکھا تو قتل کر دیا اور لاش کو دفنا دیا پھر کچھ دن بعد لاش کو نکال کر نالے میں پھینک دیا۔

شریمتی مودی اور ان کے ساتھی اس مکان میں دو تین دن رہے سنا گیا کہ اس مکان میں سے کچھ لوگوں نے حملہ کرنے والوں کا مقابلہ بھی کیا لیکن آخر میں سب پکڑے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں کسی کو پانی تک نہ ملا۔ مجبور ہو کر عورتوں نے بچوں کو پیشاب پلایا۔

ان دنوں پاکستانی ایک اور چال چل رہے تھے۔ انہوں نے سب سرکاری دفتروں اور زمینوں اور ہندوؤں کی زمینوں اور باغوں کو نیلام کرنا شروع کر دیا جو کچھ ہندو کسی طرح بچے ہوئے تھے وہ اپنے سامنے ہی اپنی زمینوں اور باغوں کو نیلام ہوتے دیکھ رہے تھے لیکن بول نہ سکتے تھے۔ میں نے کئی مسلمان بھائیوں سے کہا "تم ابھی انہیں مت خریدو" لیکن انہوں نے میری بات نہ مانی۔ اس چال سے پاکستان کو کافی روپیہ ملا۔

ان تمام مصائب کے بیچ میں دل کی ایک بات کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ

ہر وقت فوج سے متعلق باتیں تو پوچھتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی عمر کے بچوں کی ایک فوج بھی بنالی تھی۔ ایک تیر کمان اپنے گلے میں ڈال کر وہ دن بھر انہیں کچھ سکھاتا رہتا تھا۔ جب کبھی وہ سنتا کہ قبائیلیوں کا جھنڈ گلی سے نکل رہا ہے تو جھٹ کھڑکی سے جھانکنے لگتا۔ اس نے کبھی چھپنے کا نام نہ لیا۔ اپنے ساتھیوں سے اکثر کہتا "چھپنا مت، نہیں تو تمھارا نام بزدلوں میں لکھ دوں گا" ایک دن ہمارے تینوں ساتھیوں نے اس سے یہ شرط لگائی کہ اگر تم اتنے گلاس پانی پیو اور اتنی روٹیاں کھاؤ تو تم پٹھانوں سے جیت سکتے ہو اس لڑکے نے کئی گلاس پانی پیا اور کئی موٹی موٹی روٹیاں کھائیں جو ایک سات برس کا بچہ چار بار میں بھی نہیں کھا سکتا۔ سارا دن اسے اس طرح دوڑ دھوپ کرتے دیکھ کر مجھے اس پر بڑا رحم آتا تھا لیکن نہ جانے اس کے اس فوجی کھیل میں کتنی امیدیں اور جذبے چھپے ہوئے تھے۔

ایک دن ریخبر صاحب بندوق اٹھائے اور گلے میں کارتوسوں کی مالا پہنے پھر آپہنچے آتے ہی مجھ سے کہنے لگے "مجھے تمھاری یہ حالت دیکھ کر ترس آتا ہے۔ تم کتنی تکلیف اٹھا رہی ہو؟ میں تمھارے ساتھ کچھ نیکی کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا ایک دوست تمھارے شوہر کا دوست تھا۔ کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟ تم چلو، اپنے بچوں کو اور اگر کوئی جوان لڑکیاں ہوں تو انہیں بھی لے چلو تاکہ وہ سب اس مصیبت سے چھوٹ جائیں۔ تمھیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو میرے پاس دو سو کارتوس ہیں اور ایک سو پچاس روپے بھی ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی باتوں سے میں نے کیا کچھ سمجھ لیا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی اس نے سر نیچا کر لیا۔ میں نے کہا "میں مجبور ہوں۔ میں آج

آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی کیوں کہ آج ہی میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ کہیں سے اگر کسی فقیر مرد نے مجھ سے کہا کہ تین دن تک یہاں سے باہر مت جانا۔ میں تو ان باتوں پر یقین رکھتی ہوں اس لئے میں تین دن تک تو کہیں نہیں جا سکتی۔ ہاں شاید اس کے بعد آپ کے ساتھ چل سکوں" یہ کہہ کر میں نے اس کے شیطانی چہرے پر پھر ایک نظر ڈالی۔ اس بار بھی وہ میری نظر سے نظر نہیں ملا سکا۔ گردن کو جھکاتے ہوئے ہی اس نے کہا "شاید آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں آپ کے بھلے کے لئے ہی کہہ رہا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو میں رات کو لاری لاؤں گا اور آپ کو چلنا ہوگا" میں نے کہا "میں آپ کی ہمدردی کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں لیکن میں جا نہیں سکتی" وہ کہنے لگا "آپ وہم کی ان باتوں پر کیوں بھروسہ کرتی ہیں؟ میں رات کو لاری لاؤں گا" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ دیتی بھی کیا؟ وہاں تو ان کا راج تھا۔ وہ چاہتا تو زبردستی مجھے پکڑ کر لے جا سکتا تھا۔ جلتے جاتے وہ یہ بھی کہہ گیا "میری لاریاں دومیل میں ہیں اور میں ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوں" اس کے جانے کے بعد ہمارے جہازوں نے کچھ بم دومیل پر پھینکے۔ نہ جانے اس کا اور اس کی لاریوں کا کیا حشر ہوا۔ وہ پھر نہیں آیا۔

ایک دن باتوں باتوں میں خان مجھ سے کہنے لگا "بہن! تمھیں اور تمھارے بچوں کو بلکتے دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ اس آدمی کی تلاش کروں کہ جس نے مہتا صاحب کو مارا ہے ایسے میں ماروں تاکہ اس کی عورت اور بچے ایسے ہی تڑپیں جیسے تم اور تمھارے بچے تڑپ رہے ہیں" میں نے اس سے کہا "کیا میں اس کا گھر تباہ کر کے سکھی ہو سکوں گی اور کیا میرا دکھ کم ہو جائے گا۔ نہیں، میں تمھیں ایسا

کرنے کو کبھی نہیں کہوں گی۔ میں بھگوان پر بھروسہ کرتی ہوں وہی اچھے برے کام دیکھتا ہے اور وہی سزا بھی دیتا ہے۔ یا تو ہم بھگوان کو چھوڑ دیں اور آزاد بن جائیں اور یا اسے مانیں اور اس کے اصولوں پر چلیں!"

وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۱۸)

وہ قتلِ وغارت

ایک دن قبائلی اچھے اچھے نوجوانوں کو راشن کے بہانے بلا کر لے گئے اور ہسپتال میں بند کر دیا جب وہ لوگ دیر تک واپس نہ لوٹے تو ان کے رشتہ دار اُن کی تلاش میں نکلے۔ ان لوگوں نے انھیں بھی بند کر دیا۔ نانک چند کو بھی بلایا گیا لیکن جب وہ جا رہا تھا تو اسے راستے میں خان ملا اس نے نانک چند کو گھر واپس لوٹا دیا۔

دوسرے دن شہر میں بڑی ہلچل مچی۔ سب مارے خوف کے کانپ رہے تھے۔ سب کے منہ سوکھے ہوئے تھے پوچھنے پر پتہ چلا کہ جو ساٹھ ہندو کل ہسپتال میں بند کئے گئے تھے رات کو ان سب کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ سنا گیا کہ انہیں رات کو دس بجے ہسپتال سے باہر نکالا گیا اور ہماری کوٹھی میں لا کر ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک ایک آدمی کو بلایا۔ اس کے کپڑے

اتارے اور کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ جب وہ کلمہ پڑھ چکا تو ایک پٹھان عورت نے جو ان دنوں یہاں آئی ہوئی تھی چھرا ہاتھ میں لیا اور اس زندہ آدمی کا کلیجہ باہر نکال کر اسے پہاڑی سے دھکیل دیا۔ اسی طرح انہوں نے ان سب کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا بعد میں یہ دردناک اور وحشیانہ خبر ہمیں کئی شریف مسلمانوں نے سنائی۔ سب کو خطرہ تھا۔ کیا معلوم کسے کب کتے کی موت مرنا پڑے۔ ان بدقسمت اشخاص میں سے ایک کا بھائی شری چمن کے گھر رہتا تھا۔ بدقسمت کی لاش کو اس کی بیوی دیکھ آئی تھی۔

دوپہر کو جب خان میرے پاس آیا تب میں نے اس سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگا "یہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ بھلا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو ماریں" اس پر میں نے اسے وہ عورت دکھائی جو اپنے شوہر کی لاش دیکھ آئی تھی۔ وہ پھر بھی بولا "غلط ہے۔ تم اپنے نوکر کو میرے ساتھ بھیجو۔ میں دیکھوں تو لاش کہاں ہے۔ یہ لوگ جھوٹی افواہیں اڑاتے ہیں" میں نے کہا "تمہارے ساتھ میرا نوکر جا سکتا ہے۔ میں تو تمہارا یقین کرتی ہوں لیکن اور لوگ کیسے کریں؟ وہ تو لاش کو دیکھ کر آئے ہیں" وہ اٹھا اور کہنے لگا کہ میں شام کو آؤں گا تب تمہارے نوکر کو لے جاؤں گا۔ شام کو وہ آیا اور میرے دونوں ساتھیوں اوم اور جودھا کو لے گیا بازار میں انھیں ایک دوکان پر بٹھایا اور یہ کہہ کر کہ تم بیٹھو میں نماز پڑھ کر آتا ہوں نماز کے بعد وہ آیا اور ان دونوں کو ہماری کوٹھی کے نیچے والی پہاڑی پر لے گیا ان سے کہنے لگا "بتاؤ کہاں ہے وہ لاش؟" ایک جگہ خون کے دھبے دیکھے تو کہنے لگا "ہاں یہ خون ہے ضرور لیکن کیا معلوم کہ آدمی کا ہے یا ہے جانور کا۔ تم لوگ ایسے ہی ماتا جی سے کہتے رہتے ہو کہ آج یہ ہوا کل وہ ہوگا۔ اب جا کر ان سے یہی کہنا

کہ ہم نے وہاں کچھ نہیں دیکھا ہے" وہ دونوں چپ رہے۔ مارے خوف کے انہیں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ان دونوں کو خان میرے پاس لایا اور کہنے لگا "پوچھئے، کیا انہوں نے وہاں پر کہیں کوئی لاش دیکھی ہے؟" دونوں نے بتایا "ہمیں وہاں کوئی لاش نظر نہیں آئی" وہ پھر بولا "وہاں تو خون کے دھبوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ وہ خون کس کا ہے کسی جانور کا یا آدمی کا، یہ کسی کو پتہ نہیں میں صبح جا کر دیکھوں گا۔ تب آپ کو بتاؤں گا۔ میں اندھیرے میں خون کی پہچان نہیں کر سکا"!

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے دونوں ساتھیوں سے پوچھا "کیا تم نے وہاں کچھ بھی نہیں دیکھا؟" وہ کہنے لگے کہ لاش تو وہاں پر کوئی نہ تھی لیکن زمین تازہ کھودی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاش مٹی میں دبا دی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز وہاں سے نیچے پھینکی گئی ہے۔ ادھر ادھر بہت سے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ ایک جگہ پر گوشت کے کچھ ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "تو تم نے اس کے سامنے کیوں نہیں کہا کہ ہم نے یہ سب دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں کس لئے بھیجا تھا"!

وہ کہنے لگا "ہم کیا کہتے۔ ہمیں اس سے کچھ بھی پوچھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور پھر اس نے ہمیں سب کچھ اس طریقے سے دکھایا کہ ہمیں سوال پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کہنے لگا۔ ماتاجی کے سامنے کچھ مت کہنا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان کا دل دکھے یا انہیں کوئی تکلیف پہنچے" بعد میں مجھے یہ پتہ لگا کہ سچ مچ وہاں لاش دبائی گئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ خان نے یہ بھید چھپائے کیوں رکھا۔ لاشوں کو دفنایا کیوں اور پھر میرے ساتھیوں

کو وہ دکھانے کیوں لے گیا۔

دوسرے دن خان صبح پھر آیا اور بولا "میں خون دیکھنے گیا تھا۔ ابھی وہاں سے ہی آ رہا ہوں۔ وہ ایک آدمی کا خون ہے جسے یہاں کے وزیر نے مروایا ہے سنا ہے کہ کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے اس کے سارے خاندان کو قید کر رکھا ہے اور انہیں بڑی تکلیف دے رہا ہے۔ اسی وجہ سے یہ وزیر یہاں پر ہندوؤں سے اس کا بدلہ لے رہا ہے اور انہیں مروا رہا ہے۔ میں نے کہا "میں یہ نہیں مانتی کہ اس کا خاندان سرینگر میں قید ہو تو یہاں کے ہندوؤں سے اس کا بدلہ لیا جائے یہ تو لے سر پیر کی بات ہے" وہ پھر بھی بولا "چوں کہ مہاراجہ کشمیر کے کہنے پر شیخ محمد عبداللہ یہ سب کر رہا ہے۔ تبھی یہاں پر ہندوؤں کو ستایا جا رہا ہے"!

اس حادثے کا یہاں بہت اثر پڑا اور کئی دن تک لوگوں میں اس بات کی چرچا رہی۔ آخر میں اس کا بھید کھلا کہ یہ سب ڈاکٹر اور اس پارٹی کی کارروائی تھی اور کچھ مقامی مسلمان بھی اس حرکت میں شامل تھے۔

اس کے کچھ دن بعد ایک دن پھر ہندوؤں میں سخت بے چینی پھیلی۔ وہ لوگ ہندوؤں کو مسجد میں لے جانے لگے اور انہیں مسلمان بننے پر مجبور کرنے لگے۔ وہ عورت بچوں سب کو کلمہ پڑھانے اور سکھانے لگے۔ آس پاس کے گاؤں سے بھی مسلمانوں کے پنچ آئے ہوئے تھے۔ وہ ہندوؤں کو جو ان کے گاؤں سے بھاگے ہوئے تھے، لے جا رہے تھے۔ وہ شہر کے لوگوں کو بھی ان سے ہمدردی جتا کر گاؤں لے جاتے تھے اور وہاں پر انہیں مسلمان بنا کر رکھتے تھے۔ نانک چند کو بھی اس کا ایک دوست گاؤں چلنے پر مجبور کرنے لگا۔ وہ سب تیار بھی ہو گئے لیکن اتنے میں خان آیا اور اس نے ان

سب کو روکا۔ کہنے لگا "تم مت جانا۔ تم یہیں رہو۔ یہاں پر تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"
وہ رک گئے لیکن ان کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ سارے شہر میں یہ چرچا تھی کہ جو کوئی خوشی سے اسلام قبول کر لے گا وہی پاکستان میں رہ سکے گا۔ اسے اس کی چھینی ہوئی زمین بھی واپس مل جائے گی۔ ہمارے ڈیرے پر بھی کچھ لوگ آئے اور سب کو ڈرا دھمکا کر لے جانے لگے۔ میری بڑی لڑکی وینا اور بڑا لڑکا پرکاش میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ماتا جی! پاپا نے جھوٹ کہنا پسند نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں لیکن کیا اب ہمیں مسلمان بننا ہوگا؟" میں نے بچوں کو اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا "کیا تم موت سے ڈرتے ہو؟" وہ کہنے لگے "نہیں۔"

"تو پھر تمھیں کس بات کا ڈر ہے۔ جو موت سے نہیں ڈرتے۔ انہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نہیں جائیں گے" میں بولی۔

ادھر گھر کے سب لوگ جانے کو رضامند ہوتے۔ میں نے اوم سے کہا "بھائی اگر تم موت سے ڈرتے ہو تو جاؤ۔ میں تمھیں جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہیں دھکیلنا چاہتی لیکن میں اور میرے بچے نہیں جائیں گے۔ میں نقلی مسلمان نہیں بنوں گی۔" اوم نے بھی جانے سے انکار کر دیا۔ کتنا نڈر تھا وہ۔ ایک طرف موت تھی۔ دوسری طرف میں۔ لیکن اسے میرا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں تھا۔ مرنا پسند تھا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اب ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔

وہ لوگ باقی لوگوں کو مسجد میں لے گئے۔ کلمہ پڑھایا اور وضو کرنا سکھایا۔ ان میں کئی عورتیں بھی تھیں۔ میرے بارے میں بھی مسجد میں پوچھا گیا کہ اُسے کیوں نہیں لائے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ آنے سے انکار کرتی ہے۔ جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو انہیں خان

ملا اور کہنے لگا "تم یہاں پر کیوں آئے ہو؟ جلدی یہاں سے جاؤ۔ تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا" جب وہ گھر آئے تو ان کے چہروں پر خوف کی جگہ سکون تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اب انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب انہیں کوئی نہیں ستائے گا۔

دوسرے دن پولیس کا ایک افسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "آپ کل مسجد میں کیوں نہیں آئی تھیں؟ کل تو تقریباً سبھی مرد اور عورتیں مسلمان بن چکے ہیں" میں نے کہا "میں نہیں جاؤں گی۔ میں ساری چال سمجھ رہی ہوں۔ اگر پاکستان کی حکومت مجھے لکھ کر بھی دے کہ تو ہندو ہے۔ تیرے لئے یہاں اناج نہیں ہے تو بھی میں اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کے مذہب کی اتنی ہی عزت کرتی ہوں جتنی اپنے مذہب کی۔ لیکن چار دن کی زندگی کے لئے میں نقلی مسلمان نہیں بنوں گی۔ جب میں اپنے مذہب کی، جس میں میں نے جنم لیا ہے، حفاظت نہیں کر سکتی تو میں آپ کے مذہب کی، جسے میں خوف کی وجہ سے قبول کروں گی، کیسے حفاظت کر سکوں گی۔ میں ہندو رہ کر آپ کے مذہب کی عزت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اور میرے بچوں کو مار ہی تو ڈالیں گے سو ہم اس کے لئے تیار ہیں۔ مجھے میری کوٹھی میں جہاں پر میرے شوہر کو گولیوں سے مارا تھا لے چلئے۔ پہلے میرے چھ بچوں کو ختم کر دیجئے۔ پھر مجھے" اس پر وہ کہنے لگا "بہن تم بے فکر رہو۔ تمھیں کوئی مجبور نہیں کرے گا۔"

(۱۹)

خان کا تعارف

ایک دن خان میرے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ پولیس افسر وہاں آیا۔ خان کو دیکھتے ہی اس کا رنگ بدل گیا۔ وہ کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتا تھا اور پوچھا کرتا تھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ خان کو دیکھ کر وہ چلا گیا اور جب خان میرے پاس سے چلا گیا تو وہ افسر میرے پاس آکر بولا "کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ کون ہے اور کتنا خطرناک ہے۔ آپ کو ہر ایک کے سامنے نہیں آنا چاہیئے اور ہر کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے کچھ دن پہلے جو آپ کی کوٹھی میں ہندوؤں کو مارا گیا تھا۔ وہ سب اسی کی کاروائی تھی۔"

میں اس کی باتوں کا مطلب سمجھ گئی۔ میں نے اس سے کہا "تم کہتے ہو کہ مجھے ہر ایک کے سامنے نہیں آنا چاہیئے لیکن تم نے ہماری حفاظت کا کون سا انتظام کیا ہے؟ دن میں کئی مرتبہ مجھے لڑکیوں کو تہہ خانے میں چھپانا پڑتا ہے۔ وہاں ہم نے گھاس اس لئے رکھی ہے کہ وقت پڑنے پر لڑکیوں کو آگ کی پناہ مل سکے دیکھتے ہمارے گھر کے سامنے کی دھرم شالہ والے کیمپ میں عورتیں ہیں۔ قبائلی جس کو چاہتے ہیں زبردستی گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں خان کا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

اس نے سچے دل سے میری مدد کی ہے۔ آپ کی بھی ممنون ہوں۔ آپ نے بھی مجھے نصیحت دی ہے۔

اصل میں وہ خان کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ ان دنوں ان میں کچھ پھوٹ پڑ گئی تھی۔ جن لوگوں کو مسجد میں مسلمان بنایا گیا تھا جب ان سے رشتے مانگے جانے لگے تب انہیں اپنی غلطیوں کا پتہ چلا۔ کچھ تھوڑی سی شادیاں ہوئیں بھی۔ جہاں تک میں نے سنا اور دیکھا دوسری جگہوں کی طرح مظفر آباد کے مسلمانوں نے بھی تب تک کسی ہندو لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں، پاکستان سے آتے ہوئے قبائلیوں اور فوجیوں نے بڑے مظالم کئے

ایک دن خان آیا اور کہنے لگا "بہن! اب میں جا رہا ہوں۔ ہماری ساری پارٹی جا رہی ہے مجھے کچھ نشانی دو جسے میں اپنے بچوں کو دکھاوں گا" بھلا میرے پاس کیا تھا جو میں اسے دیتی۔ میں نے کہا "میرے پاس کیا ہے؟" اس نے وہ کھیس مانگا جو میں گھر سے لائی تھی۔ اسے میں نے سنبھال کر رکھا تھا۔ یہ میرے شوہر کی پسند کی چیز تھی۔ یہ سن کر میرے دل کو بڑا دھکا لگا۔ میں اسے دینا نہ چاہتی تھی لیکن انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی تیرا امتحان ہے۔ دے دے۔ دکھ کا ہے کا۔ اٹھایا اور آنسو بھری آنکھوں سے چھو کر اسے دے دیا۔ کئی مرتبہ پہلے باتوں باتوں میں اس سے کہہ چکی تھی کہ یہ کھیس میرے شوہر کو بہت عزیز تھا میں اسے سنبھال کر رکھوں گی۔ آج وہی یہ مجھ سے مانگ رہا تھا۔

سچ مچ میرے لالچی دل کو یہ کھیس دیتے ہوئے بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے میری ایک تصویر بھی لی اور کہنے لگا "بتا بہن! تیرا کشمیر میں کون ہے؟ اگر ہم وہاں پر پہنچے تو

میں اُسے ضرور بچاؤں گا" میں نے کہا "سارا کشمیر میرا ہے" وہ خاموش رہا۔ میں نے پھر کہا "جب تک آپ یہاں پر رہے آپ نے میری مدد کی اب بھگوان مددگار ہے۔"

وہ بولا "میں تمھیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ کابل چلو۔ وہاں سے پھر میں تمھیں ہندوستان پہنچا دوں گا لیکن تم مانتی نہیں ہو" میں نے کہا "میں ایک قیدی ہوں۔ میں بھاگ کر نہیں جاؤں گی۔" اس پر اس نے کہا "کل میں اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ کر لاؤں گا اور باہر دروازے پر چپکا دوں گا۔ اُسے دیکھ کر کسی کو اندر آنے کی ہمت نہ ہوگی" جب وہ چلا گیا تب اس گھر کے سب لوگ ہنسنے لگے اور مذاق کرنے لگے کہ خان اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔ اکثر جب وہ یہاں سے جاتا تو اس کی باتوں کا خوب مذاق اڑایا جاتا تھا۔ دوسرے دن وہ ایک کاغذ لایا جس پر سرخ روشنائی سے لکھا ہوا تھا "کوئی ہندو یا مسلمان بغیر اجازت اس مکان کے اندر داخل نہ ہو۔ اگر بغیر اجازت کے داخل ہوا تو کل قبائیلی علاقہ اس کا دشمن ہو جائے گا۔

"آغا جان خاں"

لیڈر، قبائیلی علاقہ

خان مجھے کاغذ دکھا کر کہنے لگا "دیکھو سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پٹھان کے خون سے لکھا گیا ہے۔ جو اس کا حکم توڑے گا اسے پوری سزا ملے گی۔ میرے پیچھے یہ کاغذ تمھاری مدد کرے گا" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ اس کاغذ پر اس کا پتہ دیکھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔

وہ چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ڈاکٹر اور اس کی پارٹی کو

ان ساٹھ آدمیوں کے قتل کے متعلق جواب دینے کے لئے واپس بلایا گیا ہے۔ خان کے جانے کے ایک ماہ بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جو پولیس نے کھول کر میرے پاس بھیجا۔ اس میں لکھا تھا۔

ہمشیرہ کرشنا۔

آداب عرض۔ میں گھر پہنچ گیا ہوں لیکن میرا دھیان تم اور تمھارے بچوں کی طرف لگا ہے۔ میں تمھارے لئے خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ ہر طرح سے تمھاری مدد کرے۔

تمھارا بھائی

آغا جان خان

بنوں، کوہاٹ

میں نے اس کے خط کا جواب دیا لیکن اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں آیا شائد حکومت کی طرف سے اُسے خط لکھنا منع تھا۔ جو اشتہار اس نے ہمارے دروازے پر چسپاں کیا تھا اس سے ہمیں کافی مدد ملی۔ عام آدمی کو اندر آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

میرے مظفر آباد چھوڑنے کے بعد بھی وہ اشتہار وہیں چپکا رہا۔ کئی لڑکیوں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے بچا کر وہاں چھپایا گیا۔ وہ سب شری نانک چند کے ساتھ بچ کر ہندوستان پہنچیں۔

(۱۹)

پاکستان کے آنسو

کبھی کبھی وہاں پاکستان کی طرف سے ہندوؤں کے لئے بڑی ہمدردی کا دکھاوا ہوتا تھا۔ ان دنوں راولپنڈی سے شرنارتھیوں کی امداد کے لئے کالیوں کے کافی ٹرک آئے ہوئے تھے۔ پرانے کمبل اور کپڑے بانٹ رہے تھے۔ ایک دن پاکستان کے لوگوں نے گڑ کی روٹیوں کی کئی پیٹیاں بھیجیں اور لڑکوں نے انہیں ہر گلی میں تقسیم کیا۔ کسی کو آدھی اور کسی کو پوری ملی۔ بچے بوڑھے، عورتیں اور بڑے بڑے عزت دار آدمی کس بیتابی سے بھکاریوں کی طرح ان پر ٹوٹ رہے تھے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بھوک کی آگ نے ان سب کو بے حال کر دیا تھا۔ روٹیاں تقسیم ہوتی دیکھ کر اوم بھی وہاں چلا گیا۔ اسے لالچ نے آگھیرا اور کچھ لڑکوں نے اُسے پہچان کر پانچ روٹیاں دے دیں۔ وہ خوشی خوشی انھیں لے کر میرے پاس آیا۔ ہنس کر کہنے لگا "ماتاجی! میں بچوں کے لئے میٹھی روٹیاں لایا ہوں" روٹیاں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے کہا اوم! یہ تم نے کیا کیا؟ بنا میرے پوچھے روٹیاں لے آئے۔ کیا تمھیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔ کیا تم میری بات بھول گئے؟ جاؤ یہ روٹیاں واپس لوٹا آؤ۔ میں جانتی ہوں کہ خوراک کی کمی ہے لیکن خوراک کی کمی سے کیا کوئی مرتا ہے۔ دیکھو میں صرف

ایک وقت کھاتی ہوں اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ لیکن اس سے کیا میری زندگی ختم ہو جائے گی؟ یہاں جتنے لوگ ہیں مجھے ان سب سے اپنے بچوں کی اور تم لوگوں کی صحت اچھی معلوم ہوتی ہے اس لئے جو بھی کام کرو میری اور اپنی عزت کا دھیان رکھ کر کرو" وہ کہنے لگا "اب ہماری کیا عزت ہے ماتاجی؟ ہم دوسروں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں" میں نے کہا "نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہماری عزت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ پہلے تھی اور آخر تک اتنی ہی رہے گی۔ ہم ان کے قیدی ہیں اور قیدی کی حیثیت سے ان کا اناج کھاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں لیتے اور نہ ہی ہم کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس سے ہمیں نیچا دیکھنا پڑے" میری بات سن کر ان لوگوں نے اپنی غلطی مان لی۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔ مجھے اکثر یہ دھیان رہتا تھا کہ نہ جانے یہ لوگ کیا کاروائی کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے جودھا اور اوم سے کہا "ہماری کوٹھی سے تھوڑی سی سبزی تو لے آؤ۔ شاید ابھی وہاں کچھ ساگ وغیرہ مل جائے اور دیکھ آنا کہ وہاں آجکل کون اترا ہے اور وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" وہ دونوں وہاں جا کر ساگ چننے لگے۔ جب وہ چن رہے تھے تو ایک سپاہی انکے پاس آیا۔ وہ بلوچ جمنٹ کا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو اور تمھیں کس نے بھیجا ہے؟" انہوں نے کہا "یہ کوٹھی یہاں کے وزیر وزارت کی تھی۔ ان کی بیوی نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔ یہ سبزی وزیر صاحب کے ہاتھ کی لگائی ہوئی ہے" وہ پوچھنے لگا "اس کا کتنا کنبہ ہے۔ کتنی لڑکیاں اور ان کی کیا عمر ہے" جواب میں انھوں نے کہا "لڑکیاں تو چھوٹی ہیں" اس پر اس نے کہا "خبردار آئندہ یہاں آنے کی کوشش مت کرنا نہیں تو گولی سے اڑا دئے جاؤ گے" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ اتنے میں اوم بھی اس کوٹھی کے چوکیدار

سے جو ہمارے وقت میں - وہاں چوکیدار تھا، باتیں کرنے کے لئے چلا گیا۔ اتنے میں وہ سپاہی واپس لوٹ آیا اور جودھا سے کہنے لگا "تمھیں ہمارا افسر بلاتا ہے جلدی چلو"۔ جودھا گھبرا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ افسر نے بھی وہی باتیں پوچھیں کہ تمھاری مالکن کی کیا عمر ہے؟ اس کی کتنی لڑکیاں ہیں۔ ان کی کیا عمر ہے اور تم یہاں پر بغیر ہمارے حکم کے کیوں آئے؟ تمھارا دوسرا ساتھی کہاں گیا؟ کیا تم نے یہاں پر کچھ دولت دفن کی ہے جسے لینے کے لئے آئے ہو؟" جودھا کانپ رہا تھا۔ اوم کو ادھر اُدھر بہت ڈھونڈا لیکن وہ نہ ملا۔ اب وہ جودھا سے بولا "تم اپنے ساتھی کو پیش کرو نہیں تو ہم تمھیں گولی سے اڑا دیں گے" اس نے کہا "میں اسے گھر جا کر لے آتا ہوں" لیکن وہ اسے تنہا آنے نہیں دیتے تھے۔ آخر انہوں نے ایک سپاہی اس کے ساتھ بھیجا۔ وہ دونوں ہمارے ڈیرے پر آئے۔ سپاہی نیچے آنگن میں دھونی کے پاس جو یہاں پر ہر وقت جلتی رہتی تھی، بیٹھ گیا۔

وہاں چمن کی ماں اور بہن بھی بیٹھی تھیں ایک انجان سپاہی کو اندر آتے دیکھ کر وہ بہت گھبرائی لیکن ذرا تسلی سے اس سے پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو" وہ جودھا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "اس آدمی نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ اپنے ساتھی کو اس نے یہاں پر چھپا رکھا ہے۔ ہم اسے لینے آئے ہیں۔ جب تک وہ نہیں ملے گا میں یہیں بیٹھا رہوں(گا)"۔ اوم گھر پر نہیں تھا۔ جودھا بھی وہیں پر سپاہی کے پاس بیٹھا رہا۔ جب اوم گھنٹہ بھر تک نہیں آیا تو چمن کی ماں نے کہا "تم یہاں سے چلے جاؤ۔ جب وہ آئے گا تو ہم اُسے وہیں بھیج دیں گے" لیکن وہ اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ وہ سب گھبراتے۔ نہ جانے یہ یہاں کیا دیکھنے آیا تھا۔ نہ جانے اب کیا گل کھلتا ہے۔ جب وہ وہاں سے نہ ہی اٹھا تب جودھا میرے پاس اوپر آیا۔ ساری بات مجھے بتائی۔ وہاں پر چمن بولا: اس

کا باپ اور تین چار آدمی اور بیٹھے تھے۔ سب لوگ یہ سن کر فکرمند ہوئے۔ چمن ذرا تیز ہو کر بولا "تم نے دو آنے کی سبزی کے لئے یہ کیا نیا بکھیڑا مول لے لیا ہے"۔ غلطی صاف میری تھی۔ لیکن ساگ کا تو بہانہ تھا۔ دراصل میں خاموش نہ رہ سکتی تھی۔ جب چار دن امن سے گذر جاتے تھے تو نئی بات دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ میں اٹھی اور نیچے گئی۔ سپاہی سے پوچھا "تم کیسے آئے ہو؟" اس نے کہا "دو آدمی ہمارے ہاں سبزی لینے آئے تھے۔ ہمارے روکنے پر ایک کو اس نے بھگا دیا۔ جب تک وہ آدمی ہمیں نہیں ملے گا۔ تب تک ہم یہاں سے نہیں جائیں گے"۔ میں نے کہا "بھائی اس میں غلطی میری ہے۔ میں نے ہی انہیں سبزی لانے باغیچے میں بھیجا تھا۔ یہ باغیچہ کبھی ہمارا تھا۔ دوسرا آدمی کہیں بھاگا نہیں ہے۔ یہیں کہیں پر ہے۔ آ جائے گا۔ تم فضول یہاں بیٹھ کر کیوں وقت برباد کرتے ہو۔ جاؤ اپنے افسر سے کہدو کہ جب وہ آدمی آ جائے گا میں بھیج دوں گی"۔ وہ اٹھا اور چلا گیا۔ باہر نکلتے ہی اوم اسے دروازے پر مل گیا اس پر وہ دونوں کو اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ اس نے ان دونوں کو خوب دھمکایا اور کہا "پھر کبھی ادھر آنے کی کوشش مت کرنا۔ اس بار میں معاف کرتا ہوں۔ اگر دوسری بار یہاں آئے تو گولی سے اڑا دئے جاؤ گے" یہ کہہ کر انہیں واپس بھیج دیا۔ بھگوان نے انہیں موت کے منہ سے بچا لیا۔

ہمارے ساتھ ہی گوردوارے میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا کیمپ تھا۔ وہاں پر ہر روز گاؤں یا شہر کے مسلمان آ کر نوجوان عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ تب سب لوگوں نے مل کر مشورہ کیا اور کچھ لڑکیوں کی شادی وہیں کیمپ کے کچھ لڑکوں کے ساتھ کر دی۔ حالانکہ وہ لڑکے شادی کے قابل نہیں تھے لیکن ظالموں کو

یہ بتانے کے لئے کہ یہ سب شادی شدہ ہیں ایسا کرنا پڑا۔ شیودیال نے بھی ایک بیوہ سے شادی کرلی۔ اس کی یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی کیوں کہ اس کی پہلی بیوی سری نگر میں موجود تھی۔ وہ کہنے لگا "اگر میں اس لڑکی کو بچا سکتا ہوں تو میں شادی کروں گا نہیں تو اسے کوئی بدمعاش لے جائے گا" اس نے شادی کی اور ہماری پارٹی سے الگ ہو کر رہنے لگا۔ اسی گوردوارے میں گرنتھ صاحب کے اوراق اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ چمن کی ماں نے انہیں اکٹھا کیا اور بعد میں بڑی مشکل سے کرشن گنگا کی نذر کر آئی۔

ہمارے ساتھ ہی کیمپ میں ایک عورت جس کے خاوند کا کچھ پتہ نہ تھا کہیں دوسرے شخص کے ہاں ایک شادی میں شرکت کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا اور وہ اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ اسے مجبور کر رہے تھے کہ کسی مسلمان سے شادی کرلے۔ وہ اسے کھانا نہیں دے سکیں گے۔ وہ کئی دن سے بھوکی تھی۔ وہ ہمارے پاس آئی اور اپنی دردبھری کہانی سنا کر کہنے لگی "میں بھوکی رہ کر جان دے دوں گی لیکن مسلمان سے شادی نہیں کروں گی۔ میرے رشتہ دار مجھے ایک مسلمان سے شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ نہ جانے اس کے بدلے میں وہ اس سے روپیہ یا اناج کیا لے رہے ہیں" میں نے اس سے کہا "تم اپنے ارادے پر ڈٹی رہو۔ تمھارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔ رہی کھانے کی بات تو صبح کا کھانا تھوڑا سا ہمارے یہاں سے لے جایا کرو۔ ہم زیادہ نہیں دے سکتے ہیں۔

جب تک ہم مظفرآباد میں رہے ایک وقت کا کھانا جو کچھ بھی دے سکتے تھے اسے دیتے رہے۔ ان دنوں ہمیں اناج کی کچھ خاص دقت نہ تھی وزیر نے ہمارے لئے سپیشل راشن منظور کر دیا تھا۔ گھی اور تھوڑا سا صابن بھی مل رہا تھا۔

ایک دن شام کو آٹھ بجے کے قریب دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ او گلی میں بڑی ہلچل مچی۔ دروازہ کھولا تو دیکھتے کیا ہیں کہ بیس تیس وردی پوش سپاہی، کچھ فوج کے افسر، بریگیڈیر وغیرہ ان کے ساتھ وہاں کے وزیر وزارت اور پولیس سپرنٹنڈنٹ سب ہیں۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے اور گھر والوں سے میرے بارے میں پوچھنے لگے "وہ کہاں ہیں؟" چمن ان افسروں کو میرے کمرے میں لے آیا۔ اس وقت وہاں مٹی کے ایک دیے کی دھندلی سی روشنی ہو رہی تھی۔ کئی دن کے بعد آج ہم نے یہ دیا جلایا ہے۔ میرے دونوں بچے میرے پاس تھے میں نے ان سے کہا "اب شاید تمھیں بھی اپنی بہنوں کے لئے مرنا پڑے" اس پر میرا بڑا لڑکا سرشیں کہنے لگا "ماتاجی، ایک تو پاپا کے خاندان کے نام کے لئے زندہ رہنے دو" میں نے اسے ڈانٹا "تم بزدل کیوں بن رہے ہو؟ بزدل بن کر تم خاندان کا نام ڈبو سکتے ہو، روشن نہیں کر سکتے" وہ کہنے لگا "میں اپنے لئے نہیں کہہ رہا ہوں ماتاجی۔ دو میں سے ایک رہے۔"

سب نے آکر مجھے سلام کیا۔ میں نے ان سے کہا "بھائی میں روز کی دقتوں سے تنگ آگئی ہوں۔ آپ ایک مرتبہ ہی ہم سب کو کیوں نہیں ختم کر دیتے؟" اس پر وہ سب کہنے لگے "آپ گھبرا کیوں رہی ہیں؟ ہم آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ راولپنڈی جا کر رہیں۔ وہاں پر آپ کا سب انتظام ہو جائے گا" میں نے کہا "میں تو آپ کی قیدی ہوں۔ ایک قیدی کی حیثیت سے آپ جہاں کہیں بھی رکھیں، رہ سکتی ہوں۔" ان میں سے ایک افسر بولا "کیا تم ہندوستان جانا چاہتی ہو؟" میں نے کہا "میں ابھی کہیں نہیں جاؤں گی یہیں رہوں گی" وہ کہنے لگے "ہم نے تمہارے لئے لاریوں کا انتظام کیا تھا لیکن تم لوگ تو کسی پر یقین نہیں کرتے ہو۔ ہم کیا کریں" اور وہ لوگ چلے گئے۔

(۱۹)

مظفر آباد الوداع

ایک دن کا ذکر ہے۔ شہر میں کسی کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سنتے تھے کہ کوئی لیڈر آنے والا ہے۔ تھا بھی ایسا ہی۔ جموں کا رہنے والا چودھری عبدالحمید آنے والا تھا۔ وہ اب پاکستان میں رہنے لگا تھا۔ گاؤں گاؤں سے لوگوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ چودھری صاحب آئے۔ بہت بڑا مجمع ہوا اور انہوں نے بہت سی تقریریں کیں۔ اس دن صبح جب میں نیند سے جاگی تو میرا دل بہت ہی اداس ہو رہا تھا۔ میں شری نانک چند کے پاس گئی اور دھونی کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اب یہاں سے جانا پڑے گا۔ نہ جانے ابھی کن کن مشکلوں کا سامنا کرنا باقی ہے" یہ کہتے کہتے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا "کہاں جا رہی ہیں آپ؟" میں نے کہا "میں نہیں جانتی لیکن میرے اندر کی آواز مجھے بتا رہی ہے کہ میں جلد ہی مظفر آباد چھوڑ دوں گی"

لیکن تب بھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمیں آج ہی مظفر آباد چھوڑنا پڑے گا ہم لوگ کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ چودھری عبدالحمید صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ ان کے ساتھ بہت سے افسر تھے اور کچھ مقامی آدمی بھی

تھے۔ لداخ گھاٹی کے رہنے والے ایک کاچرو احمد شاہ بھی ان کے ساتھ تھے پہلے وہاں پر ریاست کی طرف سے مال افسر تھے۔ گڑبڑ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ذمہ کچھ کام نہیں لیا تھا۔ آج کل یہ پھر کشمیر میں مال کا کام کر رہے ہیں۔ اور درانی بھی ان کے ساتھ تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ آتے ہی چودھری صاحب نے مہتا صاحب کے لئے بڑا افسوس ظاہر کیا۔ میں نے کہا "چودھری صاحب! آپ افسوس کس بات کا کر رہے ہیں۔ وہ تو امر ہیں۔ آپ مجھے میرے شوہر کی اس شاندار قربانی پر مبارکباد دیجئے"

اس نے کہا "آپ کو مبارک ہو" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگے "اگر مہتا صاحب نے مجھے پچھلے دنوں ریاست میں داخل ہونے سے نہ روکا ہوتا، تو میرے بچے جموں میں قتل ہونے سے بچ جاتے لیکن میرے دوست ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مجھے ریاست میں داخل نہیں ہونے دیا" میں نے کہا "چودھری صاحب، مجھے آپ کے بچوں کے قتل ہونے کا بہت ہی دکھ ہے نہ جانے لوگ پاگل کیوں ہو گئے ہیں رہے مہتا صاحب! وہ تو حکومت کے سیوک تھے۔ انہوں نے جو کیا حکومت کی ہدایت کے مطابق کیا۔ آپ کی جگہ ان کا اپنے لڑکا ہوتا تو بھی وہ ایسا ہی کرتے" وہ بولا "آپ کی سب باتیں ہم نے سنی ہیں" اور وہی باتیں ہمیں یہاں تک کھینچ لائی ہیں بتائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" کاچرو احمد شاہ بولا "یہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ تو شائد ان کے والد کو بھی جانتے ہوں گے؟" پھر اس نے میرے والد کا نام لیا۔ چودھری کہنے لگا "میں آج ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔ اگر آپ میرا یقین کریں تو میں آپ اور آپ کے بچوں کو جموں کی سرحد تک پہنچا آؤں گا۔ وہاں سے ہم آپ کے بدلے

میں اپنے کچھ آدمی لے لیں گے جو وہاں پر پھنسے ہوتے ہیں۔"

میں خاموش رہی۔ وہ پھر بولا "آپ کو کسی کا تو یقین کرنا ہی چاہیئے۔" اتنے میں درّانی کہنے لگا "بہن جی، میں بھی تو ساتھ ہوں چلئے آپ۔ آپ میں اور میری بہن میں کیا کوئی فرق ہے۔ جیسی میری بہن ویسی آپ" اس کی بہن میری سہیلی تھی یہ بات صحیح تھی۔ میں نے کہا "میں چلتی ہوں۔ مجھے سب پر بھروسہ ہے۔ انسان سے بڑھ کر بھگوان پر۔ جیسے وہ چلائے گا چلوں گی۔ یہاں بھی وہی ساتھ ہے۔ وہاں بھی وہی ساتھ رہے گا" "میرے ساتھ دو نوکر اور شریمتی مودی بھی ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے جانا ہوگا۔ اس پر چودھری بولے "سب تو نہیں جا سکتے اور نہ ہی میں انہیں لے جا سکتا ہوں" میں نے کہا "اب تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد سے ہم نے دن گذارے ہیں۔ اب میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ یا تو سب کو لے چلئے یا پھر سب کو رہنے دیجئے" بہت کہنے سننے پر وہ سب کو لے چلنے پر راضی ہو گیا۔ کہنے لگا "آپ جلدی سامان باندھیئے۔ ہم ایک گھنٹے تک آئیں گے" ہم نے جلدی جلدی اپنے چیتھڑے اکٹھے کئے اور جو کچھ ہمارے پاس ٹوٹے پھوٹے برتن تھے انہیں بھی باندھ لیا اور تیار ہو گئے۔ دوسری دکھ بھری منزل کا سفر طے کرنے کے لئے

ہم سب تعداد میں گیارہ تھے۔ دو نوکر، میں، میرے پانچ بچے۔ سریش، کملا، اور شریمتی مودی۔ جتنے خاندان اس گھر میں رہتے تھے سب کے سب آکر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے مجھے بھی مظفر آباد چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ کیسے یہاں پر آئی تھی اب اپنا سب کچھ اسی دھرتی کے نذر کر کے

جا رہی تھی۔ رہ رہ کر گلا بھر آتا تھا۔ مستقبل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کیا ہوگا، کہاں جائیں گے؟

گھنٹہ بھر بعد درّانی آیا اور چلنے کو کہا۔ ہم سب اٹھے۔ رندھے ہوئے گلے سے سب سے ملے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ درّانی آگے آگے چل رہا تھا میں اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ وہ کہنے لگا "بہن جی، آپ کو ننگے پاؤں چلتے دیکھ کر مجھے شرم آ رہی ہے" میں نے کہا "بھائی اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ یہ تو دنوں کا پھیر ہے۔ مجھے آج مظفر آباد چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ آج میں اپنے شوہر کی جدائی کو محسوس کر رہی ہوں۔ دل کو چپ کرانے کی بڑی کوشش کر رہی ہوں لیکن بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔"

یہی باتیں کرتے کرتے ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ سامان لاری پر رکھا۔ وہاں مودی بھی ملا۔ کہنے لگا "اگر غلطی سے میں نے آپ کو کوئی تکلیف دی ہو تو معاف کرنا۔"

لاری آئی اور ہم اس پر سوار ہوئے۔ میں نے دیکھا، وہی ڈرائیور اور وہی لاری جس پر میں کبھی سری نگر سے یہاں آئی تھی۔ سب کچھ وہی تھا۔ زمین وہی، آسمان وہی لیکن میری زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا "تمھیں یاد ہے کچھ مہینے پہلے تم مجھے اسی لاری سے سری نگر سے لائے تھے؟" لیکن میں نے دیکھا اس دن کے ڈرائیور میں اور آج کے ڈرائیور میں بھی زمین، آسمان کا فرق تھا۔ وہ کہنے لگا "تم ہندوستان جا رہی ہو نا؟ سنو! تمھاری ساری فوج کو چیچک نکلی ہے۔ دو دن میں تمھیں پتہ چلے گا کہ تمھاری ہندوستانی فوج کا کیا ہوا؟"

پل پر جگہ جگہ پہرے والے روک کر پوچھتے تھے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس میں کون ہے؟ جواب دیا جاتا "آزاد کشمیر بس" یہ سنتے ہی وہ انہیں جھٹ راستہ دے دیتے

تھے۔ ہماری لاری میں بہت سے مسلمان بھی بیٹھے ہوتے تھے سب نے میرے بچوں کو بہت پیار سے بٹھایا اور انھیں دیکھ کر لوگوں کے دل بہت دکھ رہے تھے۔

جب ہماری لاری گڑھی حبیب اللہ پہنچی (یہ مقام پاکستان میں ہے) تو وہاں پر بھی بہت سے آدمی جمع ہو رہے تھے۔ یہاں چودھری صاحب کی تقریر ہونے والی تھی ہمیں وہیں بٹھا کر وہ تقریر کرنے لگے۔ درانی ہمارے پاس رہا۔ اب درانی کہنے لگا "بہن جی، یہاں بڑی بڑی دقتیں ہیں۔ اگر آپ سے کوئی پوچھے کون ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ تو کچھ مت کہنا ان سے کہنا کہ وہ مجھ سے پوچھیں۔ جب کوئی بہت مجبور کرے تو کہنا یہ میرا بھائی ہے اس کے گھر جا رہی ہوں"۔ چودھری صاحب تقریر ختم کر کے آئے اور ڈرائیور سے چلنے کو کہا تاکہ وقت پر ایبٹ آباد پہنچ جائیں۔ راستے میں قبائیلی ہی قبائیلی تھے۔ لاری کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جب ہم ایبٹ آباد کے نزدیک پہنچے تو پولیس کے ایک سپاہی نے آ کر ہماری لاری روک لی۔ پوچھا "آپ اپنی مرضی سے جا رہی ہیں؟" میں نے کہا "ہاں" وہ پھر چپ ہو گیا "ان عورتوں کو آپ کہاں لے جا رہے ہیں" اور ہم سے پوچھا!!

لاری ایبٹ آباد کے ڈاک بنگلے کے سامنے رکی۔ لیکن وہاں پر کمرہ نہ ملا۔ وہاں پر پٹھان ہی پٹھان تھے۔ تب یہ لوگ ہمیں ایک ہوٹل میں لے گئے اس وقت رات کے دس بج گئے تھے۔ درانی کہنے لگا "بہن جی، آج رات یہیں پر رہیں گے۔ کل شام کو آپ کو راولپنڈی لے جائیں گے۔ آپ فکر نہ کیجئے گا۔ سب ٹھیک ہو گا" ایک کمرہ ہمیں دیا گیا۔ کھانا درانی نے منگوایا۔ سب بچوں اور نوکروں نے کھایا۔

رات کو ہم سب لوگ آرام سے سوئے۔ دوسرے دن وہاں پر چودھری صاحب کی تقریر تھی۔ وہ سارا دن باہر رہے اور شام کو آئے۔ اسی وقت سب سے چلنے

کو کہا "میں نے اور شریمتی مودی نے آج بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ کچھ پھل منگوائے وہی کھا کر پانی پی لیا۔

ہم سب پھر اسی لاری پر بیٹھے اور راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ جب ہم پنڈی پہنچے تو راستے میں درانی کے ایک رشتہ دار کا مکان پڑتا تھا وہ وہاں کچھ سامان اتارنا چاہتا تھا۔ اس جگہ پر اس نے لاری کو رکوایا اور کہنے لگا "چلئے آپ ان لوگوں سے مل آئیے۔ یہاں پر کرنل صاحب رہتے ہیں جو پہلے کشمیر میں بھی کرنل تھے۔ پچھلے دنوں جموں میں ان پر بھی بہت مصیبتیں آئیں۔ یہ سب وہاں سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں"۔

میں اور سب بچے نیچے اترے اور اندر گئے۔ یہ ایک عالیشان صاف ستھری کوٹھی تھی۔ ایک کمرے میں دھیمی آنچ جل رہی تھی۔ ایک بوڑھا شخص کوچ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا اور پاس ہی دو بوڑھی عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور فوجی وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ ہم اندر گئے اور سامنے والے قالیچے پر بیٹھ گئے ہمیں دیکھ کر وہ لوگ مسکرائے درانی نے ہمارا تعارف کرایا۔ تب وہ دونوں بوڑھی عورتیں کہنے لگیں "تو کہاں جا رہی ہے تیرے دونوں لڑکوں کو پٹھان راستے میں مار دیں گے" وہ بوڑھا آدمی بھی یہی بولا جو کرنل کہلاتا تھا۔ وہ کہنے لگا "پچاس ہزار مسلمان جموں میں داخل ہو گئے ہیں اب تمہارا جموں نہیں بچے گا۔ جو ظلم ہم پر ہندوؤں نے کئے ہیں اب ان کا بدلہ انہیں ملے گا۔

میرا ایک لڑکا ابھی تک گم ہے اس کا پتہ نہیں چل رہا" یہ کہتے کہتے اس کی

آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

سب عورتیں ہماری طرف دیکھ کر سخت قسم کی ہنسی ہنس رہی تھیں۔ وہ سچی تھیں۔ اس کے لئے میں انہیں قصور وار نہیں گردان سکتی۔ ان پر بہت کچھ بیتی تھی۔ ان کی باتیں سن کر بچے بالکل سہم گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھے اور لاری پر سوار ہوئے۔ ان کے یہ الفاظ کہ بچے زندہ نہیں پہنچیں گے میرے کانوں میں برابر گونج رہے تھے۔

یہاں سے یہ لوگ ہمیں شہر لے گئے۔ ایک جگہ پر لاری رکی۔ وہ کہنے لگے "یہاں پر کشمیر کے مسلمانوں کا کیمپ ہے۔ یہ ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ آپ کو دو ایک دن یہاں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم آپ کو جموں کی سرحد تک پہنچا دیں گے اور آپ کے بدلے میں کچھ عورتوں کو وہاں سے لے لیں گے۔"

ہم اندر گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ کچھ تھوڑے سے کشمیری ہاتھوں میں بندوقیں لئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ یہ ڈی اے وی کالج کی عمارت تھی۔ ہمیں انہوں نے ایک کمرے میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ درانی اور چودھری اگلے دن آنے کو کہہ کر چلے گئے۔

اس وقت ہم کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ اتنے میں سب کشمیری اکٹھے ہو گئے۔ لڑکوں کو باہر بلایا اور انہیں پیار سے کہنے لگے "تم سب ہمارے وطن کے ہو۔ ہم بھی کشمیری ہیں۔" میرے پاس ایک آدمی، جسے میں اس وقت نہیں پہچانتی تھی، آیا اور کہنے لگا "یہاں پر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ میں ہندو ہوں۔ مہتا صاحب میرے دوست تھے۔ میں یہاں پر آپ کی ہر طرح کی مدد کر سکتا ہوں اس کیمپ کی دیکھ بھال میں اور میرے ایک مسلمان دوست کر رہے ہیں۔ ہم آپ کے لئے راشن وغیرہ لا دیں گے۔ آپ یہیں پر کھانا پکا لیجیے۔" میں نے کہا "اس وقت میں اور شریمتی مودی کھانا

نہیں کھائیں گی۔ بچوں کے لئے چاہے کچھ منگوا دیجئے۔" اس نے بچوں کے لئے کھانا اور ہمارے لئے پھل وغیرہ بھجوا دیئے۔ ہم دونوں نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اب ہم نے دودھ پیا۔ باہر سے ان لوگوں نے کہلا بھیجا۔ "آپ فکر نہ کریں ہم بھی آج یہیں سوئیں گے۔ آپ آرام سے سو جائیے۔"

ہم سب نے سوچا کیا بات ہے۔ آخر یہ لوگ ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی سے کیوں پیش آ رہے ہیں؟ کیا یہ سچ مچ مہتا صاحب کا دوست ہے مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا انہوں نے کبھی میرا اس سے تعارف نہیں کرایا تھا۔ یہ خود کو ہندو بتا رہا ہے۔ کچھ دیر تک میں اسی سوچ بچار میں پڑی رہی۔ میرے دونوں ساتھی بہت خوف زدہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ اب یہ لوگ ہمیں ختم کر دیں گے۔ وہاں ہر شخص ہاتھ میں پستول لئے گھوم رہا تھا۔ آخر نیند نے اپنا دباؤ ڈالا اور سب خوف جاتا رہا۔

(۲۲)

راولپنڈی کیمپ میں

صبح سب اٹھے۔ ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک شخص بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے نل وغیرہ کا پتہ بتا دیا۔ اتنے میں ان لوگوں نے دودھ، گھی اور کھانے کا بہت سامان بھیجا۔ باہر کئی کشمیری مسلمان جو اس کیمپ میں رہتے تھے جمع ہو گئے۔ بچوں کو دیکھ کر کہنے لگے "ہم پر بھی بڑی مصیبتیں آئی تھیں۔

اب ہم سب یہاں ہیں۔ آپ سب ہمارے ہم وطن ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوتی ہے ہمیں بھی اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ بتائیے! ہم آپ کی کیا خدمت کریں؟" کوئی ایک بچے کو اٹھاتا تو کوئی دوسرے کو۔ یہ سب بیچارے وقت کے پھیر پر افسوس کر رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر بڑی حیران تھی کہ انہیں کس نے اتنی محبت کی تعلیم دی ہے۔ ان میں ہندو مسلمان کا کوئی تعصب نہیں ہے۔

وہیں پر میں نے اپنے شہر کے دو لڑکے دیکھے۔ ان کا مکان میرے والد کے مکان کے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے پہچانا اور فوراً میرے پاس آئے۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ میں نے پوچھا "تم یہاں پر کیسے آئے؟ تم تو جموں میں کالج میں پڑھ رہے تھے؟" دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ جموں کے فسادات نے انہیں ان کے وطن سے نکال دیا ہے۔ رہ رہ کر انہیں اپنا وطن یاد آتا ہے۔ نہ جانے ان کے ماں باپ کا کیا حال ہوگا؟ ان دونوں کی عمر تقریباً ۱۵-۱۶ برس کی تھی۔ میں نے ان سے کہا "چاہے جو کچھ بھی ہو ہمارے شہر میں اس مارکاٹ کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا، ایسا مجھے یقین ہے۔ جیسے آج تک کوئی بھی دنگا فساد یہاں نہیں ہوا ویسے امید ہے کہ آگے بھی نہیں ہوگا۔"

وہ کہنے لگے "ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن کشتواڑ کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کی بربادی نہیں دیکھ سکتے۔"

میں نے ان سے پوچھا "بتاؤ تم یہاں پر کہاں رہتے ہو اور تمہاری کون دیکھ بھال کرتا ہے؟" انہوں نے بتایا کہ یہ کیمپ "آزاد کشمیر" کی طرف سے کھلا ہوا ہے۔ کشمیر کے مسلمان پناہ گزینوں کے لئے یہاں انتظام ہے۔ اس وقت یہاں پر ۳۰ پناہ گزین

ہیں۔ ان میں جموں کے صرف وہی دو ہیں۔ ان کی دیکھ بھال مسٹر جی کے ریڈی اور ایک مسلم بھائی کرتے ہیں۔ یہاں پر روز سب کو بندوق چلانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے میں نے پوچھا کہ انہیں کون ٹریننگ دیتا ہے؟ تو وہ بولے "پاکستان کی فوج میں بہت سے کشمیری بھی ہیں۔ پاکستان نے ان میں سے کچھ کو یہاں پر بھیج دیا ہے۔" میں نے ان سے پھر پوچھا "تمہاری پڑھائی کا کیا انتظام ہے؟" انہوں نے جواب دیا "انہوں نے ہمیں کالج میں داخل کرا دیا ہے" میں نے کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ یہاں پر ہمارے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر ہندو مسلمان کا سوال ہی نہیں ہے" وہ بولے "اس کیمپ کا چلانے والا بڑا ہی نیک آدمی ہے وہ سب کو سمجھاتا ہے کہ ہمیں مذہبی تعصب سے دور رہنا چاہیئے۔ اور اسی کے کہنے پر سب کشمیری چلتے ہیں" میرا اشتیاق بڑھا۔ میں نے پوچھا "یہ جی کے ریڈی کون ہیں؟" اس پر انہوں نے بتایا کہ وہ کشمیر میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ کچھ مہینے ہوئے حکومت کشمیر نے اس کا اخبار ضبط کر لیا اور اسے وہاں سے نکال دیا۔ یہ سن کر میں سمجھ گئی کہ جو آدمی رات کو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ مہتا صاحب کا دوست ہے، شاید یہ وہی ہو۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ کچھ مہینے پہلے جب کہ یہ راولپنڈی کو جا رہے تھے انہیں مظفرآباد میں گرفتار بھی کیا گیا تھا مظفرآباد کا کرنل انہیں وہیں ختم کرنا چاہتا تھا لیکن مہتا صاحب نے اسے ایسا کرنے سے روکا تھا۔ یہ سچ مچ ان کا دوست تھا۔ اب سب باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ یہ بھی بھروسہ ہوا کہ وقت پر یہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔

اتنے میں ایک سپاہی اندر آیا۔ یہ بالکل جاپانی سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا "ماتاجی! میں بھی کشمیری ہوں۔ میں کئی سال سے جاپان میں

تھا۔ آج کل پاکستان کی فوج میں ہوں۔ ابھی میں نے سنا کہ ہمارے ہم وطن آئے ہیں تو میں سلام کرنے چلا آیا" اس طرح کئی لوگ آنے جانے لگے۔ ان سب کی زبان پر وطن ہی وطن کا لفظ تھا۔ اس دوران میں فوج کا ایک اور افسر بھی آیا۔ وہ بتانے لگا "میں بھی مہتا صاحب کا دوست ہوں" ان سب لوگوں میں وطن کی ایک عجیب و غریب کشش میں نے دیکھی۔ پھر اس کیمپ کا انچارج آیا اور دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ شری ریڈی بھی ان کے ساتھ تھے۔ بازار جا کر انہوں نے دونوں بچوں کو جوتے لے کر دئے۔ بچے پہننے سے انکار کر رہے تھے۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ جوتوں کے بغیر ان دونوں کے پاؤں میں بوائیاں پھٹ گئی تھیں۔ بڑے لڑکے سریش کو سوئٹر بھی دے دیا۔ اس نے صرف ایک ہی قمیض پہن رکھی تھی پھر اس انچارج نے انہیں اپنی کوٹھی پر لے جا کر چائے پلائی۔ کافی دیر کے بعد وہ پھر انہیں میرے پاس لے آئے۔ بڑے لڑکے نے آتے ہی مجھے جوتے دکھائے۔ لیکن اس کی آنکھیں شرم سے اٹھتی نہ تھیں اور ان میں آنسو بھی بھر آئے تھے۔ میں نے کیمپ انچارج سے کہا "آپ نے یہ تکلیف کیوں کی؟" وہ بولا "بچے تو لیتے ہی نہیں تھے۔ میں نے زور دیا۔ تب انہوں نے لئے۔ انہیں دیکھئے۔ ان کے پاؤں کی کیا حالت ہے؟ آپ کو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ مہتا صاحب ہمارے دوست تھے" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

مقررہ وقت پر وہاں کے سب شرنارتھی ٹریننگ لینے گئے۔ میرے دونوں لڑکے بھی ان کے ساتھ گئے۔ چھوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس کے تو یہ دل کی بات تھی کبھی ایک کی بندوق لیتا کبھی دوسرے کی۔ "بندوق کیسے چلاتے ہیں؟" وہ یہی پوچھ رہا تھا دن کے بارہ بجے وہ لوگ، کیمپ کا انچارج اور شری ریڈی آ کر مجھ سے کہنے

لگے کہ اگر ہم ان کی کوٹھی پر چل کر رہیں تو بہت اچھا ہو۔ وہاں پر ہماری دیکھ بھال اچھی طرح ہو سکے گی۔ اور ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ لوگوں کو جموں بھیجنے کا انتظام کب تک ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ہمیں وہاں تنہا نہیں رکھ سکتے کیوں حالت اچھی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ میں نے شریمتی مودی سے مشورہ کیا۔ ایک ناواقف شخص کے ہاں رہنے کے لئے وہ تیار نہ تھیں۔ ویسے تو یہ بات ٹھیک تھی لیکن یہ کیمپ بھی تو انہیں کے ماتحت تھا۔ چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ میں نے کہا "آپ کو چلنا ہو گا۔ وہاں رہ کر ہم اپنے وطن کا بہت کام کر سکیں گے۔ میں یہاں پر بہت سے کشمیریوں سے ملی ہوں۔ میں نے جہاں تک ان سب کو دیکھا یا سمجھا ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فسادات سے نفرت ہے۔ میں کچھ دن یہاں پر ٹھہرنا چاہتی ہوں تاکہ ان لوگوں سے ملوں اور دیکھوں کہ ان کی اپنے وطن کے لئے کیا رائے ہے؟" اس پر وہ چلنے کو راضی ہو گئیں۔ یہاں آ کر مجھے کشمیر کی بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ جیسے حملہ کرنے والے کہاں تک پہنچے تھے؟ ہندوستان کی فوج کیسے وقت پر پہنچی اور اس نے کس طرح کشمیر کی حفاظت کی؟ جموں کی بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہاں آ کر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم بہت سکھ میں ہیں حالانکہ ہمارا یہاں رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہر لمحہ یہی خوف لگا رہتا تھا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ ویسے بھی جموں تک پہنچنا ٹیڑھی کھیر تھی۔ سارا راستہ قبائلیوں سے بھرا ہوا۔ یہاں پر اپنے کئی دوست دکھائی دے رہے تھے۔ مظفر آباد سے ہم یہاں پر خود کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ تبھی کیمپ کے کچھ آدمی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "ہمارے ماں باپ، خاندان کا نہ جانے کیا حال ہو۔ کیا ہم کبھی ان سے مل سکیں گے؟" میں نے

کہا" یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ حملہ آور جہاں پہنچتے ہیں وہاں آگ لگا کر سب کچھ برباد کر دیتے ہیں اور پھر گولیوں سے بے گناہ رعایا کو مارتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا تم یقین کرتے ہو کہ تمہارے ماں باپ زندہ بچے ہوں گے۔ یہ تو ان لوگوں کا بہانا ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو ہم حفاظت سے رکھیں گے اور انہیں خاص رعایت دیں گے۔ مظفر آباد میں کئی کشمیریوں کو انہوں نے قوم پرست ہونے کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اکثر لوگوں کے مکان لوٹ لئے ہیں ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۔ یہ سب دیکھ کر میں کل سے حیران ہوں کہ تم کس کا ساتھ دے رہے ہو؟ تم اپنے وطن کو برباد کرنے والوں کے ساتھ رہ کر کتنا بڑا پاپ کر رہے ہو۔ تمھیں شیخ صاحب کی طرف دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنا خون دے کر اپنے پیارے وطن کو بچا رہا ہے۔ اس کی حکومت میں تعصب کا نام تک نہیں ہے ادھر اس لڑائی کو اسلامی لڑائی کہہ کر ابھارا جا رہا ہے۔ میں یہ سب کسی کی طرفداری کی وجہ سے نہیں کہہ رہی۔ لیکن جو بات سچ ہے وہ کہہ رہی ہوں ظالموں نے جو گڑھا کھودا ہے۔ وہ خود ہی اس میں گریں گے۔

" ہاں جموں میں جو کچھ غنڈوں نے کیا ہے اس کا مجھے دکھ ہے۔ انہوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اسی وجہ سے وہ آگے بڑھنے سے رک گئے"

میری باتیں سن کر ان میں کچھ لوگ کہنے لگے "ہم اپنے وطن کو ہر آفت سے بچانا چاہتے ہیں لیکن کیا کریں۔ یہاں پھنس گئے ہیں" یہ الفاظ انہوں نے آہستہ سے کہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گئی۔

ادھر جی کے ریڈی لاری لے کر آئے جس پر" آزاد کشمیر" لکھا تھا ہم سب اس پر سوار ہوئے۔ اس بس پر ایک امرکین فوجی بھی تھا۔ اس نے فوجی وردی پہن

رکھی تھی۔ اور سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ وہ ہمارے ساتھ چلا اور اس کے علاوہ تین چار کشمیری جو بندوقوں اور کارتوسوں سے لیس تھے ساتھ بیٹھے۔ یہ لوگ ہمیں پونچھ ہاؤس لے گئے۔ یہاں ضلع پونچھ کے راجہ کی بہت بڑی کوٹھی ہے۔ یہاں کئی موٹر سائیکلیں اور لاریاں تھیں۔ سب پر" آزاد کشمیر" لکھا ہوا تھا۔ باغ کے احاطے میں دفتر تھا۔ جہاں کی ہر چیز پر" آزاد کشمیر" لکھا ہوا تھا۔ آفس میں کئی آدمی کام کر رہے تھے۔ ہمیں اندر لے جایا گیا اور ایک سجے ہوئے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں پر سب ضروری سامان موجود تھا۔

آج تین مہینے کے بعد ہمیں یہ چیزیں دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔ جب میں اندر داخل ہوئی تو میں نے سامنے ہی ایک بڑا قد آور آئینہ رکھا ہوا دیکھا۔ جب میں اس کے سامنے آئی تو مجھے اپنی صورت دکھائی دی۔ تین ماہ کے بعد میں اپنی صورت دیکھ کر کانپ گئی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی بھکارن کو دیکھ رہی ہوں میں وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ میرے پاؤں کانپنے لگے۔ سر میں چکر آ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ کر میں وہیں بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنا پانی میری آنکھوں سے نکلا ہو گا۔ جنم سے لے کر آج تک کی ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ بہت دیر تک میں حواس باختہ سی بیٹھی رہی لیکن سوچنے کی بھی ایک حد ہے۔ آخر میں نے خود کو سنبھالا۔

انہوں نے ہمارے کھانے کے بارے میں کہا" آپ کے نوکر آپ کا کھانا بنائیں گے" ان کے خانساماں اور بیرے وغیرہ سب کشمیری مسلمان تھے۔ سب ہمیں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اس کوٹھی میں شری جی کے ڈیڈی، بریگیڈیئر رسل کے بمبر (امریکن) اور ایک مسلمان بھائی رہتے تھے۔ یہ سب کیمپ انہیں کے ماتحت تھا۔ سب کے سب ہماری دیکھ بھال میں لگ گئے۔ ہمارے نہانے کے لئے پانی گرم کرایا گیا۔ میں نے سب بچوں کو نہلایا۔ نہلانے سے ٹب کا پانی ایک دم میلا پڑ جاتا تھا۔ تین مہینے کا میل بدن پر لگا ہوا تھا۔ حالانکہ وہاں پر بھی میں انہیں کبھی کبھی نہلا دیتی تھی لیکن اتنا پانی کہاں ملتا تھا کہ اچھی طرح صابن کا استعمال کیا جا سکتا۔ غسل وغیرہ کے بعد ہمارے کمرے میں ایک بیرے نے آگ جلا دی۔ سب بڑے آرام سے بیٹھ گئے۔ رات کا کھانا آیا اور سب نے کھایا۔ بہت دن کے بعد ہمیں یہ سب آرام ملے تھے۔ اس لئے سب کو نیند نے آگھیرا۔ بچوں کو سلا کر میں باہر نکلی، دیکھا تو کشمیری رائفلیں لے کر ہمارے دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں بھی بے فکر ہو کر سو گئی۔

صبح سویرے بریگیڈیئر وغیرہ ہمارے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "آپ لوگوں کو فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ جلدی ہی ہم آپ کو جموں پہنچانے کا انتظام کریں گے" بریگیڈیئر نے یہ بھی کہا کہ وہ خود ہمارے ساتھ چلے گا تا کہ ہمیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

باہر سے بے شمار کشمیری، جن میں دکاندار، فیکٹری کے ملازم وغیرہ تھے ہمارے بارے میں سن کر وہاں جمع ہونے لگے۔ جس کشمیری نے بھی سنا وہ ہم سے ملنے آیا کئی تو بچوں کے لئے پھل تک لے کر آئے تھے۔ ان میں سے بہت سے مہتا صاحب کے دوست تھے۔ ایک نے سب کے پاؤں کا ناپ لے لی اور سب کے لئے جوتے خریدنے چلا گیا۔ میں نے بہت منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ بولا "ہم آپ لوگوں

کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں" شریمتی مودی اور میں نے جوتے نہیں پہنے۔ باقی سب کو انہوں نے پہنا دئے۔ میں ان لوگوں کی محبت دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکی۔ کتنا بھی کیوں نہ ہو میں نے کشمیری مسلمانوں کے اندر تعصب کا زہر بہت کم پایا ہے۔ کسی کے بہکاوے میں آ کر کچھ لمحوں کے لئے چاہے وہ راستے سے ہٹ گئے ہوں لیکن ان میں یہ زہر زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہاں پر کوئی غیر نہیں ہے تو میں نے ان سے کہا "کیا تم اپنے وطن کی بربادی دیکھ سکو گے؟ تم کس بھول میں ہو جب یہ لوگ وہاں پہنچیں گے تو کیا تمہارے رشتہ داروں کو چھوڑ دیں گے انہوں نے جو کچھ کیا انسانیت کو چھوڑ کر کیا ہے۔ اگر جنگ ہی کرنی تھی تو بہادروں کی طرح کرتے نہ کہ چوروں کی طرح دولت اور عورتوں کی عصمت لوٹتے پھرتے۔ انہوں نے انصاف کے نام کو دھبہ لگایا ہے" یہ باتیں سن کر ان میں سے ایک آدمی کہنے لگا "ہم نے پاکستان والوں سے کہا تھا کہ پٹھانوں کو اس طرح بے لگام نہ چھوڑو لیکن وہ نہ مانے" میں نے کہا "تمہیں سچائی کا ساتھ دینا چاہیئے اور انصاف پر چلنا چاہیئے" اس پر ایک آدمی نے بہت آہستہ سے کہا "یہاں پر زیادہ تر شیخ صاحب کے حامی ہیں۔ بس اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا" تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ چلے گئے۔

دن میں درانی آیا اور کہنے لگا "چودھری صاحب کو کسی کام سے باہر جانا پڑا ہے۔ اب میں آپ کو ایک دو دن میں جموں کی سرحد تک پہنچا آؤں گا"

اس کے جانے کے بعد آزاد کشمیر کا ڈیفنس منسٹر علی احمد شاہ میرے پاس آیا اور دیر تک مہتا صاحب کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ یہ پونچھ کا رہنے والا تھا۔

کہنے لگا "ہم سب پونچھ میں کتنی اچھی طرح مل کر رہتے تھے۔ نہ کہیں کچھ تھا اور نہ ہی ایسا ہونے کی کوئی امید تھی" میں نے انہیں مہتا صاحب کے فوٹو دکھائے جو کہ وہاں کی گورنمنٹ کی نمائش میں لئے گئے تھے۔ اس میں پونچھ کے سب افسر تھے۔ ایک آہ کھینچ کر کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید اسے وطن کی یاد آ رہی تھی۔ پھر مجھ سے کہنے لگا "آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے؟ کہئے" وہاں شری جی کے ریڈی وغیرہ بھی بیٹھے تھے۔ سب کہنے لگے "ان کے پاس آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ کپڑے کی انہیں بے حد ضرورت ہے۔ اس پر میں نے ان سے درخواست کی "میں کچھ نہیں لینا چاہتی جب تک اس لئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا تب تک بہت لیا لیکن اب تو دو دن کی بات ہے۔ اب میں کچھ نہ لوں گی آپ سب لوگ میرے لئے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کی شکر گذار ہوں"۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا اور اس نے کپڑے کے کئی تھان بھیجے۔ لیکن میں نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ شری جی کے ریڈی نے بہت کہا لیکن میں نہ مانی۔ میں نے شری ریڈی اور اس کے ساتھیوں سے مظفرآباد کے کچھ لوگوں کو نکلوانے کی درخواست کی۔ آتے وقت انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہم انہیں بھولیں نہیں۔ ان کی رہائی کا انتظام کریں۔ تب میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب موقع ملے گا تو میں ضرور اس کا انتظام کروانے کی کوشش کروں گی ان سب نے ان کے نام نوٹ کر لئے اور مجھے تسلی دی کہ وہ ضرور ان لوگوں کی مدد کریں گے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ علی بیگ کیمپ میرپور کی حالت بہت بری ہے۔ اگر ہندوستان سے یا جموں سے اس کے لئے کچھ مالی امداد ملے تو میں ان کے پاس ضرور بھجواؤں۔ علی بیگ کیمپ کی باتیں سن کر دل بہت ہی دکھی

ہوا۔

شری ریڈی نے کہا کہ وہ لوگ پٹرول کا انتظام کر رہے ہیں۔ پرسوں ہمیں جموں کی سرحد تک پہنچا دیں گے۔ بریگیڈیر رسل کے ہمراہ ایک کیمرہ لایا اور ہم سے کہنے لگا کہ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ ہم سب کا ایک فوٹو لیں۔ ان دنوں کی یادگار سب کے پاس رہے گی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس پر اس نے ہم سب کا ایک گروپ فوٹو لیا۔ اس کا بیرا ہمارے کھانے پینے کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ اور بچوں کو بہت اچھی طرح کھلاتا تھا۔ دو دن میں ہی ہم لوگوں کی حالت سدھر گئی۔

اسی دن رات کے نو بجے میں اپنے کمرے سے نکل کر ان لوگوں کے کمرے کی طرف چلی۔ جاتے ہوئے میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "آج میں خطرے میں پاؤں رکھ رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لیکن میں اپنے وطن کے لئے یہ کام ضرور کروں گی" وہ سب منع کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مجھے اپنی ذمہ داریوں اور حالات کا دھیان رکھنا چاہیئے۔ لیکن میں وطن کے سامنے کسی چیز کی قیمت نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے میں ان کے کمرے میں گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی "میں حیران ہوں کہ آپ جیسے اونچے خیالات کے لوگ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے بے گناہوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ تین دن میں ہی میں نے یہاں دیکھ لیا ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کا سبق دیا ہے میں نے اور بھی بہت سی اچھی باتیں دیکھی ہیں اس لئے میں کہتی ہوں کہ آپ کو ان کا ساتھ چھوڑنا چاہیئے اگر آپ ایسا

نہیں کریں گے تو میں بھگوان سے پرارتھنا کروں گی کہ آپ کو تین دن کے اندر اندر ہی یہاں سے استعفیٰ دینا پڑے۔ میں جانتی ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ مجھے نہ کہنا چاہیئے لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے فرض کو ادا کرتے ہوئے مجھے ڈر نہیں لگتا" میری باتیں سن کر ان میں سے ایک شخص بولا" اب تو کشمیر تھوڑے دنوں میں پاکستان کے قبضے میں آجائے گا۔ کل ۵۰۰ پٹھان جموں ستواری تک پہنچ گئے ہیں"۔ میں نے کہا "آپ سب باتیں جانتے ہیں لیکن میں کچھ جانے بغیر آپ سے کہتی ہوں کہ یہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے انہوں نے جو گڑھا کھودا ہے اس میں وہ خود ہی گریں گے۔ بے گناہوں کے خون انہیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیں گے"۔

جموں سے ہمارے تبادلے کی دو دن تک کوئی اطلاع نہ آئی لیکن تیسرے دن آگئی۔ ہمیں تین دن رکنا پڑا۔ بھگوان کی کرنی! ان لوگوں کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے تین دن کے اندر اندر اپنا استعفیٰ دینا پڑا۔ ہمارے سامنے ہی انہوں نے چارج دے دیا۔

ایک بھلا آدمی، جس کی میں جتنی تعریف کروں کم ہے ذات کا مسلمان اور بڑا ہی نیک اور اونچے خیالات کا تھا۔ اس نے اس مشکل وقت میں میری جو مدد کی اسے میں شاید ہی اس جنم میں بھولوں گی۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا "بہن! تم فکر نہ کرو۔ تمہارے بچوں کی پڑھائی میرے ذمے۔ جہاں تک ہوگا میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم ہندوستان جا کر جب تک چاہو میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔ اس نے ایک تسبیح مجھے اور ایک شریمتی مودی کو دی اور کہا "یہ معمولی سا تحفہ ہے۔ جب کبھی تم پر کوئی مصیبت آئے گی تو اس سے تمہیں تسکین ہوگی"۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

۲۳

مکتی کی جگہ جیل

ایک دن درانی سارا انتظام کرنے کے بعد ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "کل کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے"۔ اگلے دن ہم یہاں ایک ہفتہ رہ کر چلے۔ شری جی کے ریڈی اور بریگیڈیر کسی کام سے ہمارے ساتھ نہ چل سکے لیکن جس بھلے آدمی کا میں پیچھے ذکر کر چکی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوا اور درانی تو تھا ہی۔ اس کے علاوہ آٹھ کشمیری بڑی ہمدردی سے ہمارے ساتھ چلے۔

کافی سفر طے کرنے کے بعد جب ہم جہلم پل پر پہنچے تو پٹھانوں نے سامنے آکر ہماری لاری کو روک لیا۔ کچھ لوگ لاری کی چھت پر چڑھ گئے اور کچھ ارد گرد کھڑے ہوگئے۔ کہنے لگے "ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ ہم بھی مورچے پر جائیں گے" ہمارے سب ساتھی نیچے اترے اور انہیں سمجھانے لگے کہ اس میں جگہ نہیں ہے لیکن وہ تو کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے بندوقیں تان کر کہا "اگر ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ہم فائر کر دیں گے"۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم جمع ہوگیا۔ اس میں زیادہ تر پٹھان ہی تھے۔ راستے میں بھی ہم نے تھوڑا سا بوجھ اور بندوقیں اٹھائے ہوئے بہت سے پٹھان دیکھے تھے جو مورچے پر پیدل چلے جا رہے تھے۔ یکایک یہ

ایک نئی مصیبت آگئی ہم لوگ بہت گھبرائے لیکن اتنا شور مچانے کے باوجود انہوں نے لاری کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا ورنہ آفت آجاتی۔

اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور درانی اور دوسرے لوگوں سے پوچھنے لگا "تم کہاں جارہے ہو" درانی نے جواب دیا "یہ آزاد کشمیر کی لاری ہے۔ ہم ان لوگوں کو جموں کی سرحد پر پہنچانے جارہے ہیں" اس نے کہا "تم اس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک تمہارے پاس راولپنڈی کے کمشنر کا پاس نہیں ہوگا" اس پر دوسرا ساتھی بولا "ہمیں پاس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کئی مہینوں سے آزاد کشمیر میں کام کررہے ہیں۔ آپ ہمارے کام میں رکاوٹ کیوں ڈالتے ہیں؟" پولیس افسر نے بتایا کہ اب اوپر کے افسروں سے ایسی ہی ہدایت ملی ہے۔ آپ آفس چل کر معلوم کریں۔
اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں بھگوان سے سب کچھ سہنے کی پرارتھنا کرنے لگی۔

جب انہوں نے دیکھا کہ لاری اب آگے نہیں جارہی ہے تو سب پٹھان لاری پر سے اتر گئے۔ ایک آفس کے سامنے لاری کھڑی کی گئی اور ہمارے ساتھ والا شخص اندر گیا۔ میں نے درانی سے کہا "بھائی، تم سنبھل کر رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ میری خاطر تم پر کوئی آنچ آئے۔ مجھے کچھ اچھے شگون نظر نہیں آرہے۔ وہ کہنے لگا "آپ میری فکر نہ کریں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل، ہم آپ کو پہنچا دیں گے" اتنے میں وہ شخص اندر سے آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ لاری پر بیٹھتے ہوئے بولا "ان لوگوں کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہر بات میں شک کرتے ہیں۔ اب ہم واپس راولپنڈی جارہے ہیں۔ وہاں کمشنر کی کوٹھی پر چل کر ابھی پاس لے لیں گے اور کل آپ لوگوں کو جموں کی سرحد پر پہنچا دیں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں ہے" اس کی یہ باتیں سن کر میں سمجھ گئی کہ یہ سب ہماری تسلی کے لئے کہہ رہا ہے۔ معاملہ کچھ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ درانی وہیں اتر گیا۔ کہنے لگا "مجھے یہاں پر کچھ کام ہے کل آپ لوگ پاس لے کر آئیں گے تو میں یہیں پر آپ سے ملوں گا"

ہماری بس واپس راولپنڈی لوٹی۔ وہاں پہنچتے ہی ہم سیدھے کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ ہمارے ساتھ والا شخص اتر کر اندر گیا۔ پھر کچھ دیر بعد باہر آکر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آتا۔ چہرہ اس کا مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا "یہ ہم پر یقین نہیں کرتے جیسے ہم چور ہیں۔ اتنا کام کرنے پر بھی یہ ہم پر شک کرتے ہیں" اس نے شری جی کے ریڈی کو فون کیا اور وہ جلد ہی موٹر سائیکل پر وہاں پہنچ گیا۔ سب نے اندر جا کر کچھ باتیں کیں جو مجھے نہیں معلوم ہوسکیں اس کے بعد وہ سب لوگ ہم لوگوں کو لے کر پونچھ ہاؤس آئے۔ یہاں آکر انہوں نے پہرے کے لئے کچھ پولیس منگوائی۔ اس وقت یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کسی سے پوچھ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ سب گھبرائے ہوئے تھے۔ رات کو کافی پہرہ تھا۔ برگیڈیر بھی کمرے کے ایک ایک کونے کو ہاتھ میں پستول لئے دیکھ رہا تھا۔ وہ رات بھر اسی طرح گھومتا رہا۔ ہمیں ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ کچھ پٹھان آج رات کو یہاں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں پر کچھ ہندو عورتیں ہیں۔ خیر! رات کو حملہ نہیں ہوا۔ میں یہ نہیں جان سکی کہ یہ سب کیسے رکا۔

شری جی کے ریڈی نے ہمیں یقین دلایا کہ دو تین دن میں پاس مل جائے گا تو وہ ہم کو جموں کی سرحد تک پہنچا دیں گے اور اب وہ لوگ بھی یہاں پر نہیں رہیں گے۔ سب کے چہروں سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ اسی طرح پاس کے انتظار میں دو تین

دن نکل گئے لیکن پاس نہ ملا۔ ایک دن شری ریڈی نے آکر کہا "اب آپ کو جموں نہیں بھیجا جائے گا۔ آپ کا جانا بند ہو گیا ہے لیکن ہم کوشش کر رہے ہیں کہ یہ لوگ آپ کو پشاور بھیج دیں۔ وہاں سے آپ کو ہندوستان بھجوایا جا سکتا ہے۔

ہم پشاور کے پرائم منسٹر سے باتیں کر رہے ہیں۔ آج وہ یہاں پر آنے والے ہیں شام کو ان سے سب باتیں طے کریں گے۔ وہ ہمارے دوست ہیں جہاں تک ہو گا وہ آپ کو حفاظت سے بھجوا دیں گے" شام کو جب شری ریڈی اور وہی شخص جو ہم لوگوں کو پہنچانے گیا تھا قیوم صاحب سے ملنے جانے لگے تو میرے چھوٹے لڑکے ونل سے کہا "تو کہتا ہے کہ میں پٹھانوں سے نہیں ڈرتا۔ چل آج تجھے ایک بہت بڑا پٹھان دکھائیں۔ دیکھتے ہیں تو اس سے ڈرتا ہے یا نہیں" وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا اور وہ لوگ اُسے ساتھ لے کر ملنے گئے۔ لیکن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ دوسرے دن وہ لوگ اس کے پاس پھر گئے اور واپس آکر مجھے بتایا کہ اب یہ لوگ ہمیں جیل بھیج رہے ہیں۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن سب بیکار ہوا۔ ہاں جیل میں وہ ہمیں یوروپین وارڈ میں رکھا سکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر میں کچھ گھبرا گئی۔ اس وقت مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ جیل بھیجنے کی وجہ کیا ہے؟ ہاں بہت دن کے بعد معلوم ہوا کہ پاکستان سرکار کو فوجی پولیس کی سی آئی ڈی نے یہ اطلاع دی تھی کہ مجھ سے بہت سے کشمیری لوگ ملے ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت کچھ کہا ہے بلکہ وہاں کے بہت سے بھید بھی میں لے گئی ہوں۔ اس لئے میرا جموں جانا خطرناک ہے مجھے جیل میں رکھنا چاہیئے۔

یہ سب غلط بات تھی۔ میں نے کوئی فوجی بھید نہ لیا تھا۔ نہ مجھے کسی آدمی

نے یہاں کے فوجی بھید بتائے تھے۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ پاکستان کے بارے میں کشمیریوں کی رائے پوچھی تھی۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ کئی اشخاص نے مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ جب تم ہندوستان جاؤ تو ہمارے پیغامات لے جانا۔ اور ہماری فلاں فلاں بات پنڈت نہرو اور شیخ صاحب سے کہنا۔ یہ باتیں بھی کوئی فوجی بھید کی نہ تھیں

میں نے سب بچوں، شریمتی مودی اور دونوں نوکر اوم اور جودھا کو جیل جانے کی بات بتائی۔ وہ سب گھبرائے اور مجھے کہنے لگے کہ میں جو ہر ایک بات پر یقین کر لیتی ہوں یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ چودھری تو اس دن سے پھر دکھائی ہی نہیں دیا۔ درانی نے جب مشکل دیکھی تو وہ وہیں رہ گیا۔ میں کیا کہتی۔ سوچا کچھ تھا ہوا کچھ۔ سب آنے والی نئی مصیبت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دن شام کو جیل کی لاری، چھ سپاہی اور دو پولیس کے افسروں کو لے کر آئی۔ شری ریڈی اور ان کے ساتھی نے ایک بوری میں بہت سی کھانے کی چیزیں ہمارے ساتھ لے جانے کے لئے رکھیں۔ میں نے انہیں بہت روکا لیکن وہ کہتے تھے کہ نہ جانے کب کیسا وقت آئے۔ اس وقت انہیں استعمال کیجئے گا۔ ہم نے سب چیزیں اکٹھی کیں۔ وہ وقت بڑا دردناک تھا۔ ان کے گھر کے سب نوکر اور چھوٹے بڑوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کئی کشمیری باہر سے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ خانساماں نے آکر ایک افسر کو آنسو بھری آنکھوں سے کہا "خدا کے لئے صاحب ان کو اچھی طرح رکھنا" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا "یہ تمہارے کون ہوتے ہیں؟" اس نے جواب دیا "یہ ہمارے ہم وطن ہیں" یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔"

ہم سب لاری کے پاس آئے۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ ہم بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ لیکن لاچار تھے جب ہم لاری پر بیٹھنے لگے تو شری جی کے ریڈی نے مجھے تیس روپے دئے۔ میں نے لینے سے انکار کیا وہ کہنے لگا "ہو سکتا ہے کسی وقت بچوں کے لئے ضرورت پڑے۔ رکھ لیجئے" پولیس افسر بھی کہنے لگا "رکھ لیجئے تا بطور قرض ہی سہی۔ رکھ لیجئے۔ جب آپ کے پاس ہوگا تب واپس کر دیجئیگا۔" میں نے لے لئے۔

شری ریڈی نے کہا "آپ کو کچھ دن وہاں پر رہنا پڑے گا پھر آپ کو یہ لوگ جموں بھجوا دیں گے۔" میں نے شری ریڈی اور ان کے ساتھی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا "ہمارے لئے آپ نے اتنے دن تک جو کچھ کیا ہے اُسے میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔" سب نے بچوں کو پیار سے لاری میں بٹھایا۔ میں بھی لاری پر سوار ہو گئی۔ اتنے میں وہ کشمیری بیرا آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھا۔ میں نے دیکھا اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا "اماں! یہ بے گناہ بچوں کو جیل لے جا رہے ہیں۔ میرا تو دل پھٹا جا رہا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "بھگوان ہمارے ساتھ ہے۔ اسی نے ہر جگہ ہماری مدد کی ہے۔ وہی اب بھی کرے گا۔ اس بیرے نے ہم لوگوں کی بہت خدمت کی تھی وہ بچوں کو بڑے ہی لاڈ پیار سے کھلاتا تھا۔ اس کے پیار کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں سب کے جسم میں طاقت آنے لگی تھی۔ اب ہمارے لئے وہ آرام کے دن بھی خواب بن گئے۔

ہم جیل پہنچے۔ باہر پھاٹک پر لاری روکی گئی اور ہمیں اندر لے جایا گیا۔ ایک افسر نے کہا "آپ کو بی کلاس میں رکھا جائے گا لیکن نوکر آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے"

میں نے کہا "پھر تو جہاں پر نوکر رہیں گے وہیں پر ہم بھی رہیں گے ہمیں بی کلاس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جانتی تھی کہ اگر ہم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ختم کر دئے جائیں گے جیل کے باہر راولپنڈی میں، کون کسی ہندو کو زندہ دیکھ سکتا تھا۔ آخر میرے بہت کہنے پر وہ مان گئے۔

جیل کا بڑا پھاٹک کھلا۔ کافی اندر چلے جانے کے بعد ایک اور دروازہ کھلا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغ، بیچ میں بڑا سا آنگن اور ایک طرف بڑا سا برآمدہ تھا۔ اس میں تین چار کمرے تھے۔ وہی کمرے ہم کو دئے گئے۔ جگہ اچھی صاف ستھری تھی اور وہاں پر کافی پھول لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں ایک رسوئی بھی تھی۔ ہم یہاں آ گئے تب انہوں نے پوچھا "بتاؤ تمھارے پاس کیا ہے؟ معاف کرنا جیل کا قانون ہی ایسا ہے۔" میں نے وہ زیور جو مظفر آباد میں میرے پاس تھے اور وہ تیس روپے جو شری ریڈی نے دئے تھے نکال کر دئے۔ زیور انہوں نے تول لیا اور کہا "یہ آپ نہیں رکھ سکتیں۔ یہ یہاں کے داروغہ کے پاس رہے گا۔ جب آپ جائیں گی تب آپ کو واپس دے دیا جائے گا" یہاں پر جتنے ملزم اور افسر وغیرہ تھے سب بڑی عزت سے پیش آ رہے تھے۔ جسے دیکھ کر ہمیں بڑی تسلی ہوئی۔ داروغہ ہندو تھا۔ پہلے تو یہ دیکھ کر میں حیران ہوئی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جیل کے افسر نے اُسے اپنی ذمہ داری پر کچھ دنوں کے لئے رکھ لیا ہے۔ جیل کے افسروں نے ہمارا کام کرنے کے لئے قیدی مقرر کئے تھے جو باری باری سے آکر ہمارا کام کر جاتے تھے۔ اس احاطے کا دروازہ بند رہتا تھا اور پٹھان اس کی رکھوالی کرتے تھے۔

ہمیں کھانے پینے کا کافی سامان ملتا تھا۔ دودھ، گھی، انڈے وغیرہ سب ہی چیزیں دی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ سبزی بھی کافی ملتی تھی۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے کیرم بورڈ۔ تاش اور لوڈو سب انھوں نے دیئے تھے۔

کچھ کتابیں بھی دی تھیں۔ مجھے پوجا کے لئے ایک شری کرشن کی تصویر اور دھوپ وغیرہ اور گیتا اور رامائن وغیرہ پڑھنے کے لئے بھی ملیں۔ یہاں پر ہم اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگے۔ کہاں تو تین ماہ تک بچے چین کا سانس بھی نہ لے سکتے تھے اور کہاں اب اس طرح کا کھیل کود اطمینان نصیب ہوا

میں اور شریمتی مودی صبح چار بجے اٹھ کر باہر آنگن میں نل کے نیچے خوب مزے سے نہاتی تھیں۔ اس سنسان جگہ پر تاروں کی ٹمٹماہٹ میں نہانا بہت ہی پرلطف لگتا تھا۔ شام کے وقت گھنٹوں تک ہم بھگوان کا بھجن کرتے تھے۔ یہاں پر کسی طرح کی روک ٹوک نہ تھی۔

'اے' کلاس میں کچھ سکھ لیڈر تھے۔ انہوں نے جب ہمارے بارے میں سنا تو کہلا بھیجا "آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ اب تو تھوڑے ہی دنوں کی تکلیف ہے۔ شاید ہم سب یہاں سے اکٹھے جائیں گے۔ تب ہم آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے جیسے آپ نے اب تک ہر مصیبت کا مقابلہ کیا ہے، اسی طرح آگے بھی ثابت قدم رہیئے"۔

ان دنوں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جلد ہی پاکستان اور ہندوستان کے قیدیوں کا تبادلہ ہو جائے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم یہاں پر صرف چار پانچ دن کے لئے آئے ہیں لیکن دن گذرتے گئے اور ہمارے جانے کی بات بھی دور ہوتی گئی۔ ساری پارٹی مجھے کوسنے لگی کہ تم نے یہاں آکر غلطی کی۔ اب ساری عمر یہیں پر سڑنا پڑے گا۔ لیکن میں نے

انہیں سمجھا بجھا کر چپ کیا اور بتایا کہ مستقبل کے بارے میں کبھی بھی ناامید نہ ہونا چاہیئے۔

اوپر میں نے جس داروغہ کا ذکر کیا ہے وہ گھنٹوں ہمارے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اپنے بچوں کو ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلنے کو بھیجتا تھا۔ وہ ہم سے کہا کرتا تھا کہ نہ جانے یہ لوگ آپ کا اتنا خیال کیوں کرتے ہیں؟ شاید اوپر سے ہدایت ہے۔ ایک دن سچ مچ اس بارے میں یہاں کے کمشنر کا فون بھی آیا تھا۔ شریمتی مودی کے پاؤں میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ ایک کمپاونڈر روز آکر پٹی کر جاتا تھا۔ میری اور شریمتی مودی کی قمیض بالکل پھٹ گئی تھی۔ جیل کے داروغہ نے دو نئی قمیضیں اور دو چپل بنوا دی تھیں۔ یہیں پر میں نے اپنے والد، دیوروں اور دوسرے رشتہ داروں کو خطوط لکھے۔ یہاں سے کشمیر کو خط نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے پہلے انہیں ہندوستان میں ایک واقف کار کے پاس بھیجا گیا۔ وہاں سے انہوں نے انہیں کشمیر بھیج دیا۔ اس طرح تین مہینے کے بعد میرے رشتہ داروں کو میرے بارے میں معلوم ہوا۔

جو پٹھان ہمارے دروازے پر پہرہ دے دیتے تھے وہ کبھی کبھی اندر آ کر ہمارے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ کہتے تھے آج کل انہیں بڑی تکلیف ہے۔ وہ دن رات کام پر لگے رہتے ہیں لیکن ان کا دھیان گھر پر رہتا ہے۔ آج کل قبائلیوں نے گاؤں گاؤں لوٹ مچا رکھی ہے۔ انہیں سنبھالنا اب بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ کو تو حکومت نے لڑائی کے لئے بلایا ہے لیکن کچھ خود ہی لوٹ کھسوٹ کرنے آ گئے ہیں۔ یہ لوگ اور بھی کتنی ہی باتیں کرتے تھے لیکن میں انہیں یہی سمجھاتی کہ محبت سے کام لو اور تعصب کو دور پھینکو۔ یہ تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ میں دیکھتی

تھی کہ سب میری باتوں کو بڑے دھیان سے سنتے تھے۔ کبھی کبھی ہم انہیں کھانا بھی کھلاتے تھے۔

تاریخ کے حساب سے مہتا صاحب کو شہید ہوئے تین مہینے ہوئے اور اشٹمی آئی تو میں نے جیل کے ملازموں سے کہا "بھائی! میرے پاس کھانے پینے کا کافی سامان ہے میں کچھ قیدیوں کو کھانا کھلانا چاہتی ہوں" وہ لوگ مان گئے اور کچھ سادھو قیدیوں کو کھانا کھلانے لے آتے۔ ان دنوں باپو نے ہندوستان میں مرن برت رکھنا شروع کیا تھا۔ کچھ جیل کے مسلمان ملازم آکر مجھ سے کہنے لگے "دیکھو! ہندوستان کی چال۔ وہ سب طرف رخ بدلتا ہے" میں نے ان سے کہا "آج نہیں تو کل تم اس بات کی بڑی قدر کروگے۔ ابھی تمہارے دلوں میں بغض کی آگ دہک رہی ہے جب یہ سرد ہو جائے گی تب تمہیں برے بھلے کا علم ہوگا۔

(۲۸)

پھر جہنم میں

اس جیل میں دو ہفتے گذر گئے۔ انہی دنوں داروغہ نے اپنا خاندان انبالے بھیج دیا۔ ایک دن رات کو خواب میں میں نے ایک بوڑھے مہاتما کو دیکھا۔ اس نے مجھ سے کہا "تین دن میں تم یہاں سے جا رہی ہو" صبح میں نے سب کو یہ خواب سنایا تو کسی کو یقین نہ آیا۔ پھر تیسرے دن جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو داروغہ نے آکر کہا"

"آپ کو مبارک ہو آپ لوگ آج جموں جا رہے ہیں۔ کمشنر کی ایسی ہی ہدایت ہے" ہم سب تیار ہو گئے۔ سب خوش تھے کہ اب ہمارے دکھوں کا خاتمہ آپہنچا ہے۔

ٹھیک چار بجے کمشنر نے دو افسروں کے ساتھ اپنے یہاں سے اسٹیشن ویگن بھیجی۔ جب ہم جانے لگے تو سب قیدی اور ملازم جو اتنے دنوں سے ہمارا کام کر رہے تھے بڑی ہمدردی سے دعائیں مانگنے لگے کہ بھگوان ان بچوں کو ساتھ خیریت کے ان کے وطن پہنچائے۔ جاتے وقت جیل کا داروغہ زیور اور تیس روپے مجھے واپس دے گیا۔ میں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور کار پر سوار ہوئی۔ یہ لوگ ہمیں کمشنر کی کوٹھی پر لے گئے۔ یہاں کافی فوجی سپاہی تھے۔ ایک مسلمان آکر پوچھنے لگا "کیا تم شیخنیاں بنی ہو؟" میں نے کہا "نہیں، ہم ہندو ہیں شیخ نہیں ہیں اور نہ بنیں گے۔" وہ ناک بھوں سکوڑ کر چلا گیا۔ اتنے میں دونوں افسر آئے یہ دونوں دیکھنے میں پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمیں لاری پر بیٹھنے کو کہا"۔ ہم لاری پر بیٹھ گئے۔ اس میں اور بھی کچھ آدمی تھے جن میں ایک مظفر آباد کا بھی تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ میں نے پوچھا "یہ افسر کون ہیں؟" جواب ملا "ایک وزیر وزارت میرپور پشاور کے پرائم منسٹر کا بھائی اور دوسرا سی آئی ڈی کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ یہ لوگ آپ کو لے جانے کے لئے آئے ہیں؟" سی آئی ڈی کے افسر نے ہماری لاری کے شیشوں پر پردے لگوا دئے تاکہ باہر کے لوگ نہ دیکھ سکیں۔ مجھ سے آکر کہنے لگا "کیا کریں؟ حالت ایسی خراب ہے۔ لوگ قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ یہاں سے آپ کو بڑی حفاظت سے لے جانا پڑے گا۔" آگے آگے

موٹر چلی اس کے پیچھے ایک ٹرک جس میں کچھ فوجی تھے اور رضائیاں بھی بھری ہوئی تھیں بعد میں ہماری لاری تھی اور اس کے پیچھے پھر ایک ٹرک تھا ہم سب کا یہی خیال تھا کہ یہ لوگ ہمیں جموں کی سرحد پر لے جا رہے ہیں۔

جب ہم جہلم پہنچے تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہاں پر ہم رکے اور ایک مکان کے ایک کمرے میں سوئے صبح ہمارے کمرے میں وہی مظفر آباد والا آدمی آیا جو لاری میں ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ لوگ ہمیں جموں کی سرحد پر کب لے جائیں گے؟" وہ کہنے لگا "یہ لوگ آپ کو جموں نہیں، میرپور ضلع میں لے جا رہے ہیں" یہ سن کر ہم سب حیران رہ گئے۔ انہوں نے ہمیں دھوکہ کیوں دیا؟ میں نے وزیر وزارت (ڈی سی) کو اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا "آپ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں" وہ کہنے لگا "میں آپ کو ضلع میرپور لے جا رہا ہوں" میں نے کہا "آپ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے ہم سمجھ رہے تھے کہ آپ لوگ ہمیں جموں کی سرحد پر لے جا رہے ہیں آپ ہمیں پھر مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کو اس بھگوان کا خوف نہیں ہے" یہ کہتے ہوئے میرا گلا بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ کہنے لگا "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا گیا۔ آپ مجھے نہیں پہچانتیں میں بھی کشمیر میں سب جج تھا۔ میں آپ کے شوہر کو جانتا ہوں۔ میں پشاور کے پرائم منسٹر کا بھائی ہوں" اس نے اپنا نام بتایا اور کہنے لگا "مجھے کچھ دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب ہونے والا ہے اس لئے میں اپنے بچوں کو پشاور پہنچا آیا تھا۔ اب میں آزاد کشمیر کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ کیا مہتا صاحب کو پتہ نہ تھا کہ یہ سب ہونے والا ہے؟ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جاتے

یا آپ لوگوں کو سری نگر بھیج دیتے!"

میں نے کہا "مہتا صاحب اپنے خاندان اور مظفر آباد کے لوگوں میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے کیا ان سب کی جانوں سے ہماری جانیں قیمتی تھیں؟ اگر وہ چاہتے تو اس وقت بھی چھپ کر بچ سکتے تھے لیکن انہوں نے فرض کے آگے چار دن کی زندگی کو ٹھکرا دیا" وہ کہنے لگا "خیر، انہوں نے جو کچھ کیا اچھا کیا لیکن ان بچوں کی اور آپ کی زندگی کیسے کٹے گی۔ کیا کبھی آپ نے اس بارے میں بھی سوچا ہے" میں نے کہا "اس کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اچھی باتوں کا نتیجہ کبھی برا نہیں ہوتا۔ وہ سچ پر قربان ہوئے ہیں اور سچ پر ہی ہم چل رہے ہیں اور وہی ہمارا ساتھ دے گا" اس پر وہ بولا "آپ کو کوئی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ کو ہم علی بیگ کیمپ میں نہیں بھیجیں گے۔ آپ کے لئے ہم نے ابھی دو ہفتے پہلے ڈڈیال نامی جگہ پر ایک نیا کیمپ کھولا ہے۔ وہاں پر ایک بڑا شریف بوڑھا ٹھیکیدار ہے۔ اسی کے مکان میں یہ کیمپ کھولا گیا ہے۔ میں نے بڑے بڑے گھروں کی عورتوں کو، جو مسلمانوں کے گھروں میں تھیں نکلوا کر وہاں پر رکھا ہے۔ وہاں سے سبھی کو ایک ساتھ ہندوستان بھجوایا جائے گا۔ ان کے بدلے میں ہمیں مسلمان عورتیں وہاں سے ملیں گی۔ آپ آزاد کشمیر کی قیدی ہیں اس لئے آپ کو راولپنڈی میں نہیں رکھا جا سکتا۔ میں آج دن میں کام پر جا رہا ہوں۔ شام کو آ کر آپ کو ڈڈیال پہنچا دوں گا" میری بڑی لڑکی نے اسے پہچان لیا۔ پوچھا "آپ کی لڑکی میری کلاس فیلو تھی۔ اب وہ کہاں پر ہے؟" اس پر وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا "وہ سب لوگ پشاور میں ہیں۔ بیٹی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیئے۔"

سب اچھا ہوگا۔ میں آج کل وہاں کا ڈی سی ہوں۔ میں آپ لوگوں کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں سوچنے لگی کہ ہر نئی مصیبت میں بھگوان کوئی نہ کوئی سہارا بنا دیتا ہے۔ سب باتیں ہمارے امتحان کے لئے ہوتی ہیں۔ میں نے شریمتی مودی سے کہا "ہم بڑے خطرے میں جا رہے ہیں۔ وہ مظفر آباد سے بھی مشکل ہے۔ میں نے آپ سب سے چلنے کے لئے کہا تھا لیکن میں یہ نہ جانتی تھی کہ ابھی ہمیں اور ٹھوکریں کھانی ہیں۔" سب پارٹی گھبرا گئی لیکن چپ رہنے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا۔

شام کو ڈی سی آیا اور ہم سے چلنے کو کہا۔ تب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ٹرکوں میں چٹائیاں بھری ہوئی تھیں انہیں کے اوپر ہمیں بٹھایا گیا۔ وہ سفر کتنا بھدا تھا۔ بچے یہ سب دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے۔ میں نے کہا "اب تمھیں پھر ایک اور بڑے امتحان کی تیاری کرنی ہوگی جو بیتے ہوئے دنوں سے بھی مشکل ہے لیکن ہمت رکھو اور خوشی سے ان ٹرکوں پر چڑھو بھگوان تمھارا امتحان لے رہے ہیں۔" ٹرک تیزی سے چل پڑا۔ ساتھ ہی وہ لوگ موٹر میں چلے راستہ بھر پٹھان ہی پٹھان نظر آتے تھے۔ تیزی سے چلنے کی وجہ سے ہمیں بیٹھنے میں بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ گرنے کا خوف دامنگیر تھا تیز ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ جیسے تیسے ہم ایک جگہ پر پہنچے۔ یہاں ٹرک رکا۔ ڈی سی نے کہا "دتیال یہاں سے دو میل ہے۔ آپ کو پیدل چلنا پڑے گا کیونکہ وہاں ٹرک نہیں جا سکتا۔ میں یہاں سے دوسری جگہ جا رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ ایک اور آدمی جائے گا وہ آپ کو کیمپ تک پہنچا دے گا لیکن آپ کے نوکر وہاں نہیں جا سکیں گے۔ وہاں مردوں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے کہا "یہ نہیں ہوگا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے۔ میں انہیں کسی بھی حالت میں الگ نہیں کر سکتی" وہ کہنے لگا "اچھا

مجھے آپ کے لئے یہ قاعدہ توڑنا پڑے گا۔ آپ انہیں ساتھ لے جائیے۔ میرپور کے منگلا بھائی جاگیردار کا خاندان وہاں پر بھیجا گیا تھا لیکن جاگیردار کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں ملی تھی اور وہ علی بیگ کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں پر کچھ دن بعد اُسے کسی نے قتل کر دیا۔"

ہم سب ایک آدمی کے ساتھ اپنی نئی منزل کا سفر کرتے چل پڑے۔ راستہ کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ مظفر آباد کے اس شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ ذرا سنبھل کر جانا۔ یہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں لیکن اس کا علاج سوائے حوصلے اور بھگوان پر اعتماد کے اور کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ ساتھ والے شخص نے باہر سے آواز دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرہ کیا تھا جہنم کا نمونہ تھا۔ اس میں پچاس عورتیں اور بچے تھے زمین پر گھاس پڑی ہوئی تھی۔ اسی پر سب لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ سارا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہیں پر پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں اتنی بدبو تھی کہ ہمارا دم گھٹنے لگا اور ایک منٹ کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ سب عورتیں گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں تین چار بوڑھی عورتوں کو چھوڑ کر باقی سب نوجوان تھیں۔ وہ ہم سے کہنے لگیں "آپ یہاں پر کیوں آئی ہیں؟ یہاں پر بہت مصیبتیں ہیں۔ روز یہاں سے پٹھان گزرتے ہیں کئی بار انہوں نے یہاں آنے کی کوشش کی ہے۔ بہن، اس زندگی سے تو مرنا اچھا ہے۔ ہم چکی پیستے ہیں۔ ہمارے منہ میں سوکھا باجرا کھا کھا کر پیپ پڑ گئی ہے" دو چار عورتوں نے تو اپنا منہ بھی کھول کر دکھایا۔ سچ مچ زخم ہی زخم تھے۔ پھر کہنے لگیں "دیکھو، ہمارے بالوں میں کتنی جوئیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ ہمارے بستر کے اوپر رینگ

رہی ہیں" انہوں نے مجھے روشنی میں وہ بوریاں دکھائیں جو وہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ سچ مچ ان پر جوئیں رینگ رہی تھیں۔

ہم سب یہ دیکھ کر بہت گھبرائے اور ہمارا حوصلہ جاتا رہا۔ پھر دو چار کو چھوڑ کر وہ سب کلمہ پڑھنے لگیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو وہ کہنے لگیں "ہم تو پکے مسلمان ہیں تین تین مہینے تک ہم ان کے گھروں میں رہے ہیں۔ اب یہ لوگ ہمیں یہاں لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمھیں ہندوستان بھیجیں گے۔ دیکھا جائیگا جب بھیجیں گے۔ ابھی تو یہ لوگ ہماری اور بھی بے عزتی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیمپ جو انھوں نے بنایا ہے۔ اس کی ہر جگہ یہی شہرت ہے کہ جگہ جگہ کی نوجوان اور خوبصورت عورتیں یہاں پر ہیں۔ ہر وقت پٹھان اور آزاد کشمیر کے آدمی بری نیت سے یہاں آتے ہیں لیکن ہماری قسمت سے یہاں کا کیمپ کمانڈر اچھا ہے۔ وہ کسی کو اندر نہیں آنے دیتا اسی وجہ سے وہ لوگ اس کے بھی دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر تم یہاں پر رہو گی تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا" میرے ساتھی یہ سن کر رونے لگے اور کہنے لگے "نہ جانے اس ڈی سی کو کیا سوجھی جو ہمیں یہاں لے آیا" میں اندر نہیں ٹھہر سکی اور باہر آنگن میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں کیمپ کمانڈنٹ جسے وہاں ٹھیکیدار کہتے تھے، اندر آیا اس کی عمر تقریباً پچاس برس کی تھی۔ دیکھنے سے وہ کوئی بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ آتے ہی مجھ سے کہنے لگا "آپ کو یہ لوگ یہاں کیوں لائے ہیں، یہاں تو بڑی تکلیفیں ہیں۔ یہاں تو ہر وقت قبائیلیوں کا خوف لگا رہتا ہے اس کیمپ کی شہرت پھیل گئی ہے کہ یہاں پر جوان عورتیں ہیں۔ اور وہ لوگ بھی یہیں ہیں جن کے گھروں سے یہ عورتیں نکال کر لائی گئی ہیں۔ وہ انہیں پھر بھگا کر لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا کہوں یہ عورتیں بھی بڑی عجیب ہیں۔ کہتی ہیں ہم ہندوستان نہیں جائیں گے۔ ہمیں

انہیں کے ساتھ بھیجدو۔ یہاں پر میں ہوں اور ایک میرا نوکر ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی ایک رشتے دار عورت کو کھانا پکانے کے لئے رکھا ہے۔ اپنا سارا خاندان جہلم پہنچا آیا ہوں۔ اپنے سب مکان اس احاطے میں کیمپ کے لئے خالی کر دئیے ہیں۔ میری بھی لڑکیاں ہیں میں انہیں انہی کی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے۔ وہی بچائے گا۔ میں نے جس کام کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کو آخر تک نبھاؤں گا۔ آزاد کشمیر والوں نے کوئی خاص انتظام نہیں کیا ہے۔ کل کی بات ہے کہ پٹھانوں کا لیڈر بادشاہ گل اپنے کچھ پٹھان ساتھیوں کے ساتھ یہاں آیا۔ ساتھ میں ایک لاری اور مشین گن بھی لایا تھا وہ یہاں سے کچھ جوان لڑکیوں کو لینے آیا تھا۔ بتائیے اگر خدا ہی میری مدد نہ کرتا تو میں ان کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ یہاں آکر انھوں نے دروازے کھٹکھٹانے شروع کئے اور گالیاں دے دے کر کہنے لگے "کھولو کواڑ ورنہ ہم توڑ دیں گے" میں اتنا گرا ہوا کام کبھی نہ کر سکتا تھا کہ ان بے گناہ، پناہ میں آئی ہوئی لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دیتا۔ چاہے وہ لوگ مجھے مار ہی کیوں نہ دیتے۔ یہ لوگ اسلام کے نام پر دھبہ لگا رہے ہیں لیکن میں دنیا کو بتا دوں گا کہ سچا اسلام کیا ہے؟ اور وہ کیا کہتا ہے۔ جب وہ لوگ بہت دق کرنے لگے تو میں پچھلی دیوار پھاند کر گاؤں میں چلا گیا اور وہاں پر میں نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور کچھ آدمیوں کو گوندپور تھانے پر اطلاع دینے کیلئے بھیجا۔ گاؤں والوں کو دیکھ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں ان مسلمانوں میں سے نہیں ہوں جو کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے اپنا ایمان کھو بیٹھے ہیں۔ کل آپ کو اور بھی یہاں کی باتیں سناؤں گا۔ اوپر کی منزل میں اور بھی عورتیں ہیں۔ آج آپ کو باہر کی طرف کے کمرے دیتے ہیں کل میں اپنے ساتھ والا کمرہ آپ کے لئے خالی کرا دوں گا۔ آپ لوگ اپنا سب انتظام الگ کر لیں۔ رات کو ذرا سنبھل کر سونا۔ ظالموں کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔ ان دو ہفتوں میں انھوں

نے کئی بار یہاں پر حملے کرنے کی کوشش کی ہے۔" میں نے کہا "آپ کے خیالات بڑے ہی اچھے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں آپ سے بہت کچھ سیکھوں گی۔ آپ کو کیا مشکل پیش آسکتی ہے۔ سچائی آپ کی مدد کرے گی جسے آپ نے اپنایا ہے۔"

ہم سب لوگ باہر کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں بھی کافی سامان تھا۔ نوکروں نے سامان ایک طرف رکھا اور نیچے گھاس بچھا کر اس پر ہمارے بستر بچھا دیئے۔ لیکن رات بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ سب اس نئی آنے والی مصیبت سے گھبرائے ہوئے تھے۔ میں بھی ہمت ہار چکی تھی۔ خاص طور پر مجھے ان عورتوں کی حالت پر رونا آ رہا تھا ساتھ ہی لڑکیوں اور اوم اور جودھا کی بھی فکر تھی۔ نہ جانے کس وقت انہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اسی بیچ میں میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کتنی کوشش کی کہ دل کو سنبھال لوں لیکن بیکار۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آتے۔ کیا ہندوستانی عورت میں اتنی بزدلی آگئی ہے جو وہ خود اعتمادی کو کھو بیٹھی ہیں اسے تو جنم سے ہی مرنا سکھایا جاتا تھا لیکن اب تو ان لوگوں میں تکلیفیں برداشت کرنے کی کوئی طاقت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو اپنے اوپر مصیبت ڈال کر بھی انہیں ہندوستان لے جاؤں گی اور انہیں ہمت دینے کی کوشش کروں گی تاکہ یہ دکھ کا مقابلہ خوشی خوشی کر سکیں۔

اسی طرح رات گذر گئی۔ صبح باری باری سے عورتیں میرے کمرے میں آنے لگیں اور اپنی درد بھری کہانی سنانے لگیں۔ جسے سن کر دل کانپ اٹھتا تھا۔ مجھے اپنی مصیبت ان دکھوں کے سامنے ہیچ نظر آئی میں اتنا روئی کہ میرے سبھی ساتھی پریشان ہو گئے۔

وہ حیران تھے کہ اسے آج کیا ہو گیا ہے؟ پورے دو دن تک میری یہی حالت رہی۔

دتیال کیمپ سے کوئی چار میل دور گوندپور گاؤں تھا۔ آزاد کشمیر والوں نے ضلع کا دفتر وہیں پر رکھا تھا۔ تھانہ بھی یہیں تھا۔ اس علاقے میں پٹھان بہت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ یہاں کے مسلمانوں کو بھی لوٹتے تھے اور ان کے جانوروں وغیرہ کو مار کر کھا جاتے تھے۔ اس لئے آزاد کشمیر والوں نے ذمہ دار افسر سب پٹھان ہی رکھے تھے۔ پولیس بھی پٹھانوں کی رکھی تھی لیکن فائدہ کچھ نہیں تھا۔ جب پٹھانوں کا قافلہ نکلتا تو کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ انھیں روکے۔ ان عورتوں کے منہ سے جو سنا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ میرپور کے مسلمانوں نے ہندو عورتوں بچوں اور مردوں پر جتنے ظلم کئے ہیں شاید ہی اتنے کسی جگہ ہوئے ہوں۔

شام کے وقت گوندپور سے تین کالج کے لڑکے آئے۔ یہ پشاور سے یہاں کے کیمپ کی دیکھ بھال کرنے آتے تھے ان میں سے ایک یہاں کے ڈی سی کا بھتیجا تھا اور باقی دو اس کے دوست تھے۔ یہ میرے پاس آئے اور میری لال آنکھیں دیکھ کر بولے "آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں" میں نے کہا "کل سے ان عورتوں کی حالت دیکھ کر میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے" وہ کہنے لگے "آئندہ سب ٹھیک ہو گا۔ اب تک جو ہونا تھا سو ہو گیا" میں نے کہا "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نے یہ کیمپ مذاق کیلئے بنایا ہے۔ محض دکھاوے کے لئے دو بوڑھے سپاہی رکھ چھوڑے ہیں۔ ہر روز پٹھانوں کا خطرہ رہتا ہے۔ ان کی یہ حالت ہے کہ نہ ان کے پاس بستر ہیں اور نہ کپڑے۔ گھاس پر پڑی رہتی ہیں اور دو دو روٹیاں کھانے کو مل جاتی ہیں" وہ کہنے لگے "یہ سب باتیں ہم ڈی سی سے کہیں گے" ان میں ڈی سی کا بھتیجا بہت ہی شریف نظر آیا۔ کہنے لگا

"اگر آپ علی بیگ کیمپ کی حالت دیکھیں یا پوری طرح سنیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں پران کو کتنا آرام ہے۔"

وہ کیمپ کیا تھا۔ کافی بڑے احاطے میں چار پانچ مکان ایک ساتھ بنے ہوئے تھے بیچ آنگن میں ایک کنواں تھا۔ آس پاس میلوں تک کھیت ہی کھیت تھے۔

تھوڑی دور پر مسلمانوں کے نو دس گھر تھے۔ اس مکان کے نچلے حصے میں پچاس عورتیں اور بچے تھے۔ ان سب کا کھانا ایک جگہ بنتا تھا باری باری سے وہ خود کھانا بناتی تھیں۔ انہیں ایک مٹی کی ہنڈیا ملی ہوتی تھی۔ اسی میں دال بنتی تھی اور تنور میں روٹیاں لگا لیتی تھیں۔ دوسری منزل میں تیس کے قریب عورتیں اور بچے تھے۔ یہ اپنا کھانا الگ پکاتی تھیں۔ یہاں مجھے کچھ میرپور کی جانی پہچانی عورتیں ملیں شریمتی مودی کی بھی کئی جان پہچان کی تھیں۔

شام کو ڈی سی کا سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور مجھے الگ بلا کر کہنے لگا "مجھے بتایئے آپ اپنا زیور یا روپیہ مظفرآباد میں زمین میں گڑا ہوا تو نہیں چھوڑ آئی ہیں۔ اگر ہو تو ہم وہاں سے منگوا کر آپ کے لئے یہاں پر خرچ کریں گے۔" میں نے کہا میرا زیور یا روپیہ جو کچھ بھی تھا کوٹھی میں ہی رہ گیا۔ میں نے کہیں گاڑا نہیں تھا۔"

پھر میں نے اس سے بڑی نرمی سے کہا "میں نے یہاں آ کر بہت کچھ سنا ہے۔ اگر تم ہمارا یا ان بہنوں کا پورا انتظام نہیں کر سکتے تو یہ کیمپ کیوں بنایا ہے؟ آپ کو ان کے ساتھ اچھی طرح سلوک کرنا ہوگا اور جو یہاں پر پہرہ دیتے ہیں۔ ان سے بھی یہی کہنا ہوگا۔"

اس نے پہرے والے بوڑھے سپاہیوں کو میرے سامنے بلا کر کہا "ان کا

خاص خیال رکھنا۔ اگر کوئی بھی شکایت آئی تو تم لوگوں کو گولی سے اڑا دوں گا۔"

ان سپاہیوں کی بابت میں نے بہت کچھ سنا تھا کہ ان کا کیمپ کی عورتوں کے ساتھ بہت برا سلوک تھا ڈی سی بھی آیا اس نے سب کو ایک ایک نئی رضائی دی اور ہمارے پاس جو پرانی رضائیاں تھیں وہ لے لیں۔

۲۵

ہندوستان نہیں جائیں گی

ایک دن کیمپ کمانڈنٹ مجھ سے کہنے لگا "بہن جی! یہ عورتیں ہندوستان نہیں جانا چاہتیں۔ ان میں صرف تھوڑی سی ہیں جو جانا چاہتی ہیں۔ میں انہیں بہت سمجھا چکا ہوں لیکن یہ مانتی ہی نہیں۔ اب ڈی سی کے سامنے ان کے بیان ہوں گے۔ جو جانے پر راضی ہوں گی انہیں بھیجا جائے گا جو نہیں جانا چاہیں گی انہیں جن کے گھروں سے لاتے تھے انہیں کے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ دیکھتے لیتے امیر گھروں کی عورتوں کو قصائی، مزدور، کسان اور موچی وغیرہ بھگا کر لے گئے۔ یہ ان کے پاس تین تین مہینے رہیں۔ اس کام میں آپ میری مدد کریں اور جب میں باہر جاؤں تو آپ ان کی دیکھ بھال کریں۔ آپ کو اس کیمپ پر پورا حق ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میں بہت متاثر ہوئی اور میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سب عورتوں سے کہا کہ کل ہم سب صبح اور شام مل کر بھگوان کا بھجن کریں گے۔

کچھ تو مان گئیں لیکن کچھ کہنے لگیں کہ وہ تو مسلمان ہیں وہ بھجن میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ آتما ہو گا کیوں کہ بھجن کرنے سے کسی کا دھرم نہیں جاتا۔ دوسرے دن بھگوان کے بھجن کے لئے جو عورتیں آئیں میں نے ان سے کہا "دو سال ہوئے مجھے سری نگر میں ایک مہاتما ملے تھے۔ جنھیں سب مگن بابا کہتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ مگن رہنے کا اپدیش دیا تھا۔ انہوں نے مجھے کچھ ایسے بھجن بتلائے تھے جن سے سچ مچ مجھے شکتی ملتی رہی۔ وہی بھجن میں یہاں بتاؤں گی اور دیکھو آج تک تم پر جو بیتی ہے سب جبراً تھی تمھارا کوئی قصور نہ تھا۔ اب آگے جو برا کرو گی وہ پاپ ہو گا کیوں کہ وہ تم جان بوجھ کر کرو گی۔ اس مصیبت سے تمھیں سبق سیکھنا چاہیئے۔ اپنا فرض نہیں بھولنا چاہیئے۔

میری باتیں سن کر وہ کہنے لگیں کہ ان پر کیا بیتی ہے؟ کیا بتائیں۔ ان کے سامنے ان کے شوہر اور بچے کلہاڑوں سے قتل کر دئے گئے۔ قاتل کہتے تھے کہ وہ کافروں پر چھ آنے کی گولی خرچ نہیں کریں گے۔ وہ انہیں اپنے گھر لے گئے اور ان سے نکاح کیا۔ ان کے گودی کے بچے راستے میں پھینک دئے گئے۔ ایک عورت نے کہا "میں نے پہاڑی سے نیچے چھلانگ لگائی کہ جان نکل جائے۔ کمر ٹوٹ گئی لیکن جان نہیں نکلی" دوسری بولی "میں کوئیں میں کود گئی تھی۔ وہ مجھے کوئیں سے نکال لائے۔ ایک نے اپنا بدن اور منہ دکھایا جس پر برچھیوں کے کئی گھاؤ تھے۔ وہ بولی "میں نے کہہ کر اپنے اوپر پانچ وار برچھوں کے کروالئے لیکن میں مری نہیں۔ وہی ہوا جس سے میں ڈرتی تھی۔ اب تم کہتی ہو، یہ کرو، وہ کرو، بتاؤ کہاں ہے تمھارا بھگوان؟"

میں نے کسی طرح ان کی ڈھارس بندھائی اور سب مل کر بھگوان کا بھجن کرنے لگیں۔ اس کے بعد یہ روزمرہ کا اصول بن گیا۔ آخر میں کئی دن کی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ سب

ہندوستان آنے پر راضی ہو گئیں۔ انھوں نے ڈی سی سے کہا "کہ چاہے ہمارے ٹکڑے کر دو لیکن ہم ہندوستان ہی جائیں گی۔"

کچھ ہی دنوں میں بھگوان کی مہربانی سے کیمپ کی حالت سدھر گئی۔ پہرے کے لئے اور سپاہی آ گئے۔ اب بھی ہر روز لوگوں کے گھروں سے دو دو چار چار عورتیں لائی جاتی تھیں جنھیں سمجھانے کے لئے مجھے کئی کئی دن لگ جاتے تھے یہاں تک کہ مجھے ان کے ساتھ سختی بھی کرنی پڑتی تھی۔ لیکن آخر میں وہ سب اپنے فرض کو پہچان گئیں۔

بعد میں چھان بین کرنے پر پتہ چلا کہ جو عورتیں ہندوستان نہیں آنا چاہتی تھیں ان میں ان کا قصور نہیں تھا۔ انہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ تمھیں ہمارے گھروں سے نکال کر پٹھانوں کے ہاتھوں میں دے دیں گے۔ اگر تم ہندوستان بھی گئیں تو تمھارے ساتھ کوئی بات تک نہ کرے گا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بے فکر رہیں۔ مانا یہاں پٹھانوں کا ڈر ہے لیکن ہم بھی تو ان کے ساتھ ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اپنی لڑکیوں سے پہلے میں انہیں بچانے کی کوشش کروں گی اور انہیں ہر طرح سے مضبوط رہنے کی بات سمجھائی۔ جب انھوں نے میرے پریم کو سمجھا تو وہ سب تیار ہو گئیں۔ کہنے لگیں کہ ہندوستان پہنچ کر، جو میں کہوں گی، وہی وہ سب کریں گی۔ اس پر کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر مایوس ہو جاتی تھیں کہ ہم کبھی ہندوستان جائیں گے بھی یا یہیں گھل گھل کر مر جائیں گے۔ لیکن میں ان سے کہتی "اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس مت ہو۔ جو ہو گا اچھا ہی ہو گا۔ تم سب کو کہنا چاہیئے کہ تم ہندوستان جاؤ گی۔"

سب سپاہی مجھے ماتا جی کہتے تھے۔ گاؤں سے بھی مسلمان عورتیں میرے پاس آتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں پوچھتی تھیں۔ میں انھیں سمجھاتی تھی کہ جو کچھ اس علاقے

میں ہو رہا ہے یا ہوا ہے وہ تم لوگوں پر مصیبت لائے گا تم عورتیں ہو تمھیں عورت ذات کی اس بے حرمتی کو محسوس کرنا چاہیئے۔ یہ جو ہندو عورتیں تمھارے گھروں میں جا رہی ہیں یہ آگ کی چنگاریاں ہیں کسی بھی وقت دہک اٹھیں گی۔ گھروں میں کتنی پھوٹ پڑ رہی ہے جب کوئی شخص کسی ہندو عورت کو اپنے گھر لے جاتا ہے تو پہلی عورت، اس کے بچے اور ماں باپ، سب میں جھگڑا ہوتا ہے اور تمھاری زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ تم سب بہنیں مل کر مدد کرو تو جس عورت پر ظلم ہو رہا ہے وہ بچ جائے گی اور دوسرے تمھارا گھر جہنم نہیں بنے گا۔" میری یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی اور وہ اس بات کی مذمت کرنے لگیں۔ انھوں نے مجھے کئی لڑکیوں کا پتہ بتایا جو کیمپ میں رہنے والی عورتوں کی بیٹیاں تھیں۔ میں نے کیمپ کے سپاہیوں کی مدد سے انہیں لوگوں کے گھروں سے نکلوایا۔ یہ لوگ میری بات مانتے تھے

اس کام میں کیمپ کے کمانڈنٹ نے بھی بڑی مدد کی۔ اب رونا دھونا کم ہو گیا۔ وہ صبح شام مل کر بھجن کرنے لگیں۔ کچھ مسلمانوں نے اس بات پر اعتراض کیا کہ یہاں بھجن کیوں پڑھے جاتے ہیں؟ رات کو جب ہم بھجن کرتے تھے تو یہ لوگ باہر خالی فائر کرتے تھے۔ اور ہم سے آکر کہتے تھے کہ پٹھان آتے ہیں۔ بھجن بند کرو۔ ہم بند نہیں کرتے تھے لیکن جب انہوں نے بہت اعتراض کیا تو ہم آہستہ آہستہ بھجن کرنے لگے لیکن چھوڑا نہیں وہ سب سمجھ گئے کہ اب یہاں دال گلنے والی نہیں اس لئے انہوں نے اعتراض کرنا چھوڑ دیا۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی وہاں ہر وقت قبائیلیوں کا خوف لگا رہتا تھا۔ اکثر قبائیلیوں کی پارٹیاں جب اس راستے سے ہو کر نوشہرہ کے مورچے پر جاتی تھیں تو کیمپ کے لوگوں پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ بات بھی خوف کی تھی۔ جن کے گھروں سے عورتیں یہاں لا کر

رکھی گئی تھیں۔ وہ انھیں بتاتے تھے کہ یہاں اچھے اچھے گھروں کی نوجوان لڑکیاں ہیں۔ اس لئے جب ان کی پارٹیاں ہمارے کیمپ کے سامنے سے گذرتیں تو سارے کیمپ میں سناٹا چھا جاتا۔ کوئی عورت اونچا سانس تک نہ لیتی تھی۔ کوئی گھاس میں تو کوئی کسی کونے میں چھپ جاتی تھی۔ رونے میں ہنسنے کی بات یہ تھی کہ اس خوف میں وہ میری طرف دیکھتی رہتی تھیں کہ جو اپدیش میں انہیں دیتی ہوں خود بھی اس پر چلتی ہوں یا نہیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے گھیر کر بیٹھ جاتیں۔ تب میں ان سے کہتی "ڈرو مت مضبوط رہو اور پوری طاقت سے مصیبت کا سامنا کرو۔ اگر ابھی سے ڈر کی وجہ سے اپنی طاقت کھو دو گی تو وقت پر اپنی حفاظت نہیں کر سکو گی" میں آہستہ آہستہ رام نام کا جاپ کرتی تھی۔ وہ بھی جاپ کرتی جاتی تھیں اور اس طرح ڈر ٹل جاتا تھا۔ میرا چھوٹا لڑکا دل جب سنتا تھا کہ کوئی پارٹی آ رہی ہے تو جھٹ باہر سے دوڑ کر میرے پاس آتا اور مجھ سے کہتا "سنو ماتا جی! پٹھانوں کی پارٹی اس طرف آ رہی ہے۔ تم فکر مت کرو تم یہیں بیٹھو اور لڑکیوں کو گھاس میں چھپا دو۔ میں باہر جاتا ہوں۔ میں کسی کو اس وقت کیمپ کے اندر نہیں آنے دوں گا جب تک میں زندہ ہوں۔" وہ بے خوف ہو کر باہر چلا جاتا تھا۔ میں نے اسے ایک دن بھی نہیں روکا میں اس کا دل توڑنا نہ چاہتی تھی اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی نہیں جتانا چاہتی تھی کہ وہ بچہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے جانے کے بعد میں اکثر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتی تھی۔ ماں کی ممتا آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگتی تھی۔ کبھی کبھی سوچتی تھی۔ جانے زندہ لوٹے گا بھی یا نہیں؟ کہیں باہر گولی چلی تو بچے سے ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔ میں کہتی "میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن میں اسے ڈرانا نہیں چاہتی۔"

اس روز روز کے حملے سے ہم سب تنگ آ گئے تھے لیکن ہنستے رہنے کے

علاوہ اور کوئی علاج بھی نہ تھا۔ ایک بار میں سب بچوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ سب کہنے لگے کہ اب زندگی کا یہ ناٹک ختم ہونا چاہیئے۔ ایسا کب تک چلے گا؟ یہاں سے چھوٹنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اب گرمی آرہی ہے کھیتوں میں سانپ نکلیں گے۔ جس دن اس زندگی سے عاجز آجائیں گے جا کر کھیتوں میں لیٹ جائیں گے اور سب کو سانپ کاٹ لیں گے۔ گھل گھل کر مرنے سے موت کہیں اچھی ہے۔

ایک بار پاس والے گاؤں میں پٹھانوں کی ایک پارٹی آئی۔ آپس میں کچھ کہا سنی ہو گئی گاؤں والوں نے ان کا ایک ساتھی مار دیا۔ پھر کیا تھا۔ سب پٹھان وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ ان کے جانور مار مار کر کھا گئے وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہتے تھے جب تک وہ گاؤں والوں کا ایک آدمی نہیں مار لیں گے تب تک نہیں اٹھیں گے۔ گاؤں والوں نے بہت کہا کہ وہ سب مسلمان ہیں۔ اب جانے دو لیکن تین دن تک وہ لوگ وہیں بیٹھے رہے۔ بعد میں سرکاری آدمی نے آ کر انہیں وہاں سے اٹھایا۔ اسی طرح ایک دن ہمارے کیمپ کے پہرے دار سپاہی کے گھر پچیس قبائلی آ کر بیٹھ گئے اندر سے آٹا وغیرہ سب نکال کر کھایا۔ پھر بھی اٹھنے کا نام نہ لیا سب گھبرائے۔ پولیس بلوائی گئی۔ وہ بھی پٹھان تھے انہوں نے آ کر قبائلیوں کو سمجھایا کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ اٹھو اور اپنے گھر جاؤ۔ وہ کہنے لگے کہ وہ مورچے پر لڑنے جا رہے ہیں پولیس کے آدمی نے کہا کہ وہ پچیس آدمی ہیں اور ان کے پاس ایک بندوق ہے۔ وہ مورچے پر جا کر کیا کریں گے بہت ڈرانے دھمکانے پر وہ وہاں سے ٹلے۔ چودھا بھی کبھی کہتا تھا کہ چاہے اُسے ہتیا ہی کا پاپ لگے لیکن جیتے جی ان لڑکیوں کو کہیں نہیں جانے دے گا۔ جب وقت آئے گا تو ان کا گلا گھونٹ کر خاندان کی عزت بچا لے

گا۔ اس پر لڑکیاں "پہلے میرا" "پہلے میرا" کہنے لگتی تھیں۔ ایسی بھیانک حالت تھی لیکن اس اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن تھی۔ کیمپ کا انچارج ٹھیکیدار ہماری ہر طرح سے مدد کرتا تھا۔ نہ جانے بھگوان نے اُسے کتنا نیک بنایا تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ ایک بار ایک گاؤں کی ہندو عورت کیمپ میں آئی۔ اس کا سارا خاندان مارا گیا تھا۔ ایک بچہ بچا تھا۔ اس عورت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اور اس کا بچہ بہت بیمار تھے۔ اس عورت کا پیٹ بہت خراب ہو گیا تھا۔ اسے بار بار پتا آتا تھا اور باہر جانے کی طاقت نہ تھی۔ ایسی حالت میں کیمپ کا انچارج ٹھیکیدار اس کا پاخانہ خود اٹھاتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کام میں کروں گی مجھے خدمت کرنے میں شانتی ملتی ہے لیکن وہ نہیں مانا۔ سچ مچ وہ ایک مہان شخص تھا۔ وہ ملک کا سچا ہمدرد تھا اسے اپنے دھرم کے بھائیوں کے ظلموں سے سخت نفرت تھی۔ ساری ساری رات قرآن شریف پڑھتے میں نے اسے دیکھا تھا۔ بھگوان سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کرتا تھا کہ وہ ان بے گناہ عورتوں کی حفاظت کرے۔ انہیں معاف کرے۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر میں نے اس سے کہا کہ جب ہم چلے جائیں، اس کے بعد بھی دو لڑکیوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑا کر اپنے یہاں رکھے۔ اس نے ایسا ہی کیا ہمارے ہندوستان میں آنے کے بعد اس نے کیمپ میں کچھ اور لڑکیاں رکھیں اور وہ بہت اچھی حالت میں ہندوستان پہنچیں۔

کیمپ کی عورتوں کو سب سے بڑا دکھ تب ہوتا جب انہیں کیمپ کی صفائی وغیرہ کا کام کرنا پڑتا تھا اکثر عورتیں روتی تھیں۔ ہائے، ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ آج یہ لوگ ہم سے کام کرا رہے ہیں۔ جو کل ہمارے ٹکڑوں پر پلتے تھے آج پاؤں سے دھکیل دھکیل کر حکم دیتے ہیں۔ وہ گالی دینے سے بھی نہ جھجکتے تھے اکثر یہ سپاہی جب وہاں کیمپ کا

انچارج نہیں ہوتا تھا تو تعصب کے زہر اثر بدتمیزی کر بیٹھتے تھے تب بھی میں ان عورتوں کو سمجھاتی تھی۔ یہ دکھی ہونے کی بات نہیں ہے۔ دیکھو خود میں بھی جھاڑو لے کر اپنے گھر کے باہر صفائی کرتی ہوں۔ میں اسے برا نہیں سمجھتی۔ وہ میری بات مان لیتی تھیں۔ ہمیں پاخانے کے لئے کھلے کھیتوں میں جانا پڑتا تھا وہاں خوف لگا رہتا تھا کہیں پیچھے سے قبائلی چھپ کر نہ آجائیں۔ میں جب کھیتوں میں جاتی تو کیمپ کا ایک کتا میرے ساتھ جاتا۔ جب تک میں وہاں رہتی وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر دوڑتا رہتا تھا۔ جب میں لوٹتی تو ساتھ لوٹ آتا تھا۔ حالانکہ میں نے کبھی اُسے روٹی کا ٹکڑا تک نہ دیا تھا اور نہ ہی کبھی پیار کیا تھا لیکن وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا تھا۔ وہ سب کہتے کہ دیکھو کتا بھی ماتا جی کی مدد کرتا ہے۔ وہ سچ کہتے تھے۔ حیوانوں نے وقت وقت پر میری مدد کی۔

اس کیمپ میں ایک لڑکی تھی۔ یہ میرپور کے اچھے گھرانے کی تھی۔ اس کا شوہر مارا گیا تھا لیکن سسر وغیرہ زندہ تھے۔ سال بھر کا بچہ اس کی گود میں تھا۔ سسر نے خوف سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اکثر کیمپ میں اس کے پاس آتا تھا اور اسے تنگ کرتا تھا کہتا تھا کہ تم اسی مسلمان کے پاس چلی جاؤ جس کے سپرد میں نے تمھیں کیا تھا۔ ہندوستان جا کر کیا کرو گی۔ وہاں کوئی تمھارے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرے گا۔ وہ میرے پاس آ کر روتی تھی کہتی تھی "بہن! جس دن سے ہم نے بھجن کیرتن شروع کیا ہے کسی چیز کی خواہش نہیں رہی ہے۔ ساری دنیا ایک کھیل تماشہ دکھائی دینے لگی ہے۔ ہم نے اپنے فرض کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ یہ میرا سسر مجھے مجبور کر رہا ہے۔ پھر مسلمان کے گھر جانے کو کہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم نہیں گئیں تو مجھے بھی وہ لوگ مار دیں گے۔ اصل میں اس نے مجھے ایک گیہوں کی بوری بھر اناج اور کچھ تھوڑیں سے

روپیوں کے عوض بیچ دیا تھا" یہ لڑکی بڑی ہونہار تھی اور بڑے پریم سے بھجن کیرتن کرتی تھی۔ کافی عرصہ تک متھرا برندا بن رہ چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا "سسر کو کہہ دو کہ چاہے وہ اسے ماریں یا رکھیں تمھیں دکھ نہیں ہے اور یہ کہ تم ان کے گھر نہیں جاؤ گی چاہے ہندوستان میں کوئی اپنائے یا نہ اپنائے۔" لڑکی نے یہی کہا اور آخر میں وہ بچ گئی۔

(۲۶)

اسے ساری عمر پاکستان میں رکھو

ایک دن میرپور کے کچھ مقامی آدمی رات کے وقت کچھ پرانے کپڑے وغیرہ لے کر کیمپ دیکھنے آئے اور کیمپ کے انچارج سے کہنے لگے کہ یہاں ان کے محلے کی کچھ ہندو عورتیں ہیں وہ ان سے ملیں گے۔ وہ سب مسلمان تھے۔ کیمپ کا انچارج انہیں میرپور کی کچھ عورتوں کے پاس لے گیا۔ انہوں نے انہیں کچھ کپڑے اور شاید چار چار چھ چھ آنے دیے۔ وہ ان عورتوں نے لے لئے۔ جب آدمی پہ مصیبت آتی ہے تب اس کی عقل سچ مچ کام نہیں کرتی۔ ان کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ہم ان ظالموں سے پیسے کپڑے کیوں لے رہے ہیں۔ انہوں نے ہی ہم سب کو برباد کیا ہے۔ اصل میں وہ لوگ اسی بہانے ان عورتوں کو پسند کرنے آتے تھے کہتے تھے وہ انھیں محبت سے مل جائیں

گے اور اپنے یہاں رکھیں گے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس کیمپ کی کوئی بھی عورت پاکستان میں نہیں رہے گی سب ہندوستان جائیں گی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میں ان سب کو یہ باتیں سمجھا رہی ہوں تو وہ آگ بگولہ ہو کہ کہنے لگے کہ کیا ابھی کافروں کی عورتوں میں اتنا غرور ہے ؟ انہوں نے ڈی سی کے پاس جا کر کہا کہ اس عورت کو ساری عمر پاکستان میں رکھو۔ یہ بات بڑے زور سے کہی گئی۔ مجھے کیمپ کے انچارج نے سب باتیں بتائی ہیں نے اس سے کہا "تم جا کر میری طرف سے ڈی سی سے کہدو کہ اگر میرے یہاں رہنے سے یہ سب نہیں ہندوستان چلی جائیں تو میں ساری عمر پاکستان میں رہنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے کوئی خوف نہیں ہے" وہ بولا "ڈی سی نے انہیں وہیں دھمکا کر کہا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں غلط خیال کر رہے ہیں۔ وہ تمھیں بھارت جانے سے نہیں روک سکتے"۔

پھر ان لوگوں نے دوسری چال چلی، ایک گاؤں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ یہاں ان کافروں کی عورتوں کو کس آرام سے رکھا گیا ہے۔ ریاست جموں میں ہماری مسلمان بہنوں کو شیخ محمد عبداللہ نے مورچہ کھدائی پر لگا رکھا ہے ایک قمیض اور نیکر ان کے تن پر ہے۔ پھر کیا تھا۔ سب گاؤں والے بلا سوچے سمجھے کیمپ انچارج کے پاس آتے وہ بھی کچھ تیز ہو گیا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا کہ وہ ہم لوگوں کے لئے یہاں کیا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ سارا علاقہ اس کا دشمن ہو رہا ہے۔ لیکن جموں میں ان کی بہنوں پر بڑے ظلم ہو رہے ہیں میں نے اس سے کہا "بھائی صاحب، میں تو اس بات پر یقین نہیں کرتی۔ شیخ صاحب کے ہوتے ہوتے وہاں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو کیمپ کو برباد کرنے کے لئے سب غلط باتیں اڑا رہے ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ ہمیں ایک ہی بار ختم کر دیں تا کہ ہم بھی ان روز روز کے دکھوں سے چھٹکارا پائیں" لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ وہ تو سچا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ

اُسے ایسی ایسی باتیں بتا کر تنگ کرتے تھے۔ ایک دن پھر ایک کشمیری بھائی جو اس ضلع میں کنٹرول افسر تھا، سڑا ہوا گیہوں اور بدبودار چاول لے آیا اور کیمپ کے انچارج کو دکھا کر کہنے لگا "تم روز ہمیں تنگ کرتے ہو کہ ان عورتوں کے لئے اچھا اناج وغیرہ دو۔ دیکھو، جموں میں یہ کیڑے والا آٹا اور یہ سڑا ہوا چاول ہماری بہنوں کو دیا جاتا ہے" ایسی ہی تعصب کی باتیں پھیلا کر وہ اس کیمپ کو برباد کرنا چاہتے تھے۔ ان باتوں سے کیمپ میں کافی ہلچل مچ جاتی تھی۔

ایک دن ڈی سی کے سامنے ایک سپاہی کے گھر سے ایک پندرہ سال کی لڑکی لائی گئی۔ سپاہی اور اس لڑکی کا چاچا بھی ساتھ تھا۔ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اب مسلمان بن گیا تھا۔ لڑکی روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی "میں کیمپ میں نہیں جاؤں گی۔ وہاں ہندو عورتیں ہیں میں مسلمان ہوں"۔ اتفاق سے ادم وہاں پر تھا۔ اُسے دیکھ کر ڈی سی نے کہا "تم اسے کیمپ میں لے جاؤ" وہ اور دو تین آدمی اسے کیمپ میں لے آئے۔ وہ رو رو کر چلا رہی تھی۔ جب وہ کیمپ میں آئی کسی ہندو عورت سے چھوتی تک نہیں۔ یہی کہتی جاتی چاہے کچھ بھی ہو میں ہندوستان نہیں جاؤں گی۔ تمہارا چھوا تک نہیں کھاؤں گی" اسے سب نے سمجھایا لیکن بیکار۔ تب کچھ عورتیں میرے پاس آئیں۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا "بیٹی تم نے کیا شور مچا رکھا ہے۔ اگر تم جانا نہیں چاہتی تو دوسری بات ہے لیکن یہ پاگل پن چھوڑ کر رونا دھونا بند کرو۔ تمھیں زبردستی کوئی نہیں رکھے گا حوصلہ کرو۔ سب سنو، سمجھو، پھر جیسا مناسب ہو کرنا۔ میں تمھیں کیمپ میں نہیں رکھوں گی۔ تم میرے ساتھ رہو۔ دیکھو یہ سب تمھاری ہی بہنیں ہیں۔ وہ میرے پاس رہنے کے لئے راضی ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا

اپنی بیتی سناؤ۔ کس کی لڑکی ہو؟ ماں باپ کہاں ہیں؟" وہ دیکھنے سے خاندانی اور ہونہار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کا نام بتایا۔ کہنے لگی "جب ہم لوگ میرپور سے بھاگے تو پتاجی ہم سے چھوٹ گئے۔ میں، میری ماں اور دو چھوٹے بھائی علی بیگ کیمپ میں لائے گئے۔ ایک چھوٹا بھائی راستے میں ایک دوڑتے ہوئے اونٹ کے پاؤں کے نیچے آگیا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ آپ نے علی بیگ کیمپ کے ظلم تو سنے ہوں گے۔ وہاں آزاد کشمیر والے عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے" یہاں کچھ وہ رکی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ کچھ سنبھل کر اس نے پھر کہا "جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا۔ بچے ہوئے ہندوؤں کو نہر کے کنارے لے جا کر کلہاڑوں سے باری باری مارتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ بہت سے ظلم کرتے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے وہاں سے کسی لڑکی یا عورت کو گھر لے جاتا ہے یا قبائلیوں کو سونپ دیتا ہے۔ بارہ بارہ اور تیرہ تیرہ آنے میں لڑکیاں مسلمانوں نے بیچی ہیں۔ قبائلیوں کا تو مورچے پر آنے جانے کا راستہ ہی علی بیگ کیمپ کے بیچ سے بنایا گیا ہے۔ آتے جاتے وہ وہیں ٹھہرتے ہیں اور من مانے ظلم کرتے ہیں۔ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں۔ منہ سے کوئی کچھ بولا کہ گولی کا شکار ہوا۔ کبھی کبھی تھوڑا سا سڑا گلا اناج دے دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ پیچش سے بیمار ہیں۔ بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ وہ لوگ اتنے بے رحم ہیں کہ بیمار آدمی کو بھی باہر پاخانے جانے کی سہولت نہیں دیتے۔ ایک دن ایک بوڑھے آدمی کو بہت پیچش ہو رہی تھی۔ وہ باہر جانے کے لئے اٹھا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ گر پڑا۔ بیچارے کا پاخانہ وہیں نکل گیا۔ تب ایک سپاہی نے آکر اس سے کہا کہ "ابھی تک اس میں مستی ہے"۔ اس نے گڑگڑا کر کہا کہ اس کے بس کی بات نہیں

ہے۔ ابھی صاف کئے دیتا ہے۔ لیکن ظالم نے اسے گولی سے مار دیا۔ عورتوں کی جو حالت ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ سب جب میری ماں نے دیکھا تو وہاں کے ایک آدمی کو بلا کر کہا کہ میں یہ لڑکی تمہیں سپرد کرتی ہوں۔ تم اسے اپنے گھر لے جاؤ تاکہ یہ ان ظلموں سے بچ جائے۔ وہی یہ سپاہی تھا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے آیا لیکن اس کی عورت اور ماں باپ بگڑ گئے۔ یہ ان سے الگ ہو گیا۔ اب مجھے اسی کے پاس سے لایا گیا ہے۔" میں نے پوچھا "تمہاری ماں کہاں ہے؟" وہ کہنے لگی "اسے وہیں سے میرپور کا ایک کسان اپنے گھر لے گیا اور اپنے ساتھ نکاح پڑھنے پر مجبور کرنے لگا۔ لیکن ماں نہیں مانی وہ جب بہت تنگ کرنے لگا تو ایک دن جب وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا ماں نے وقت پا کر کچھ مٹی کا تیل، جو وہیں پڑا ہوا تھا، اپنے اوپر چھڑک لیا اور آگ لگا لی۔ اتنے میں وہ آگیا۔ اس نے ماں کو مرنے سے بچایا لیکن ماں کی چھاتی اور منہ کافی جل گیا تھا۔ کسان پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور وہ اسے پھر کیمپ میں پہنچا آیا۔ ماں کافی زخمی تھی۔ اتفاق سے ایک دن کچھ مرگ شرنارتھیوں کے لئے جموں گئے۔ ان میں چن چن کر بوڑھی اور زخمی عورتیں بھیج گئیں۔ انہیں میں ماں بھی چلی گئی۔ آج کل وہ ہندوستان میں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں۔ جیسا تم کہو گی ہم ویسا ہی کریں گی اگر تم چاہو تو یہیں رہو اگر چاہو تو ہمارے ساتھ ہندوستان جا سکتی ہو" وہ کہنے لگی "آپ لوگوں کو ہندوستان کون بھیجے گا؟ یہ تو کہنے کی بات ہے۔ ہم اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے یا یہ لوگ ہمیں پٹھانوں کے ہاتھ سونپ دیں گے اس سے تو اچھا ہے کہ آدمی ایک ٹھکانے رہے۔" میں نے اسے سمجھایا "جب ہم کوئی کام کرنے لگتے ہیں تب اس کی برائی اور بھلائی دونوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ہم سچ

پر چلتے ہوئے دونوں باتوں کے لئے تیار ہیں اگر ہندوستان بھیجا تو بھی اگر تڑپنے کو یہاں رکھا تو بھی۔ ہمیں دیکھو ہم بے خوف ہو کر دن کاٹ رہے ہیں۔ ہم ان دھمکیوں نہیں ڈرتے جب تک ہمت ہے کسی کی مجال نہیں کہ ہمیں اپنے قول سے گرائے۔ تم نے اپنے ملک کی بہادر عورتوں کی تاریخ تو پڑھی ہوگی، ہم بھی انہیں کی اولاد ہیں۔ جب وہ ہنستے ہنستے سب برداشت کرتی تھیں تو کیا ہم نہیں کر سکتے ؟ ہم کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی خود اعتمادی پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ یہ سب کچھ سن کر وہ چپ چاپ کچھ سوچنے لگی۔ بیس منٹ کے بعد اس نے مجھ سے کہا "میں تمھیں اپنی ماں کے برابر سمجھتی ہوں۔ اگر تم مجھے اپنے پاس رکھو تو میں ہندوستان جاؤں گی" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی لڑکیوں سے پہلے تمھارا خیال رکھوں گی" وہ میرے پاس رہنے لگی۔ اس کے لئے مجھے بہت سی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، لیکن میں نے اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ سپاہی جس کے پاس وہ رہتی تھی ہر روز کیمپ میں آکر بیٹھتا تھا اور خط لکھ کر بھیجتا تھا۔ "تم آجاؤ میرا ساتھ مت چھوڑو۔ میں نے تمھارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے" وہاں کے سپاہیوں سے کہا کرتا تھا۔ "اسے کسی طرح یہاں سے بھگا دو" میں اسے باہر تک نہیں نکلنے دیتی تھی۔ بہت سی باتیں ہوتیں مجھ سے اس نے کہلا بھیجا "اگر تم اسے نہیں چھوڑو گی تو تم پر مصیبت آئے گی۔ تمھاری لڑکیاں ہیں ان کا دھیان رکھنا" میں نے ان باتوں کی پرواہ نہیں کی۔ بھگوان میرے ساتھ تھا۔ اس کی سب چالیں بےکار گئیں۔

ایک دن رات کو بیس برس کی عمر کی ایک اور لڑکی کیمپ میں لائی گئی۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ یہ جب بارہ سال کی تھی تو اس کے باپ راجوری، ریاست کشمیر میں

پولیس افسر تھے ان دنوں مہتا صاحب بھی وہیں تھے۔ میں اسے پہچان گئی۔ وہ کہنے لگی "میرے شوہر کو تو اسی دن ختم کر دیا تھا میں اپنے پتا کے ایک مسلمان دوست کے پاس تھی۔ اس نے مجھے بڑی اچھی طرح رکھا لیکن ایک پولیس افسر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے عہد کیا ہے کہ چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں لیکن میں شادی نہیں کروں گی" یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور کہنے لگی "کیا تم مجھے بچانے کا وعدہ کرو گی؟ یہ وعدہ کرو کہ جب یہاں سے جاؤ گی مجھے ساتھ لیکر جاؤ گی مجھے ظالموں کے ہاتھوں سے بچاؤ گی" میں نے اس سے کہا "تم ہمت نہ چھوڑو جب تم اپنی حفاظت کے لئے سچے دل سے موت کا سواگت کر رہی ہو تو کس کی ہمت ہے کہ وہ تمھیں دھرم سے گرائے۔ تم بے فکر رہو" یہ دیکھنے میں بڑی خوبصورت تھی لیکن مصیبتوں نے اسے مسل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے کناروں پر برابر روتے رہنے کی وجہ سے زخم ہو گئے تھے۔ کیمپ میں رہنے سے اُسے کچھ سکون ملا۔

کیمپ میں جموں کا ایک مسلمان بھائی ہر روز آتا تھا۔ اس کا سارا خاندان جموں میں مارا گیا تھا صرف دو چھوٹے لڑکے بچے ہوئے تھے۔ وہ بھی جموں میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ اکثر کیمپ میں آکر گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کسی بچے کو اٹھاتا کبھی کسی بچے کو کچھ دیتا۔ میرے پاس آکر بھی بیٹھتا تھا۔ میں اسے ڈھارس بندھاتی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے کہا "بہن جی! تم بھی کبھی سن لو گی کہ جموں کے مسلمانوں نے اپنا بدلہ چکا لیا ہے" میں نے اسے جواب دیا تھا "بتاؤ تمھیں اس سے کیا ملے گا؟ دیکھو مجھے بدلے سے کتنی نفرت ہے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں" تب وہ کہتا تھا "ہم ایسا نہیں کر سکتے" کبھی کبھی وہ بچوں کی یاد میں آنسو بہاتا تھا۔ نہ جانے وہ کیمپ

میں کس طرح ہوں گے۔ میں نے اس سے کہا "جب میں جموں جاؤں گی، تمھارے بچّے سے ملوں گی اور جہاں تک ہو گا ان کی مدد کروں گی۔ ہندوستان آ کر میں نے ان کا پتہ لگا لیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے وہ پاکستان بھیج دیئے گئے ہیں۔

علی بیگ کیمپ کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں نے ڈی سی کے پاس جا کر بہت کچھ شور شر مچایا کہ علی بیگ کیمپ میں گندگی سے بہت ہی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ بیماری پھیلنے کا خطرہ ہے۔ کچھ گاؤں والوں کے کہنے پر اور کچھ ریڈ کراس والوں کی خبر سُن کر حکومت نے علی بیگ کیمپ کی طرف توجہ دی۔ چار مہینے کے بعد اُنہیں نہانے کا پانی دیا گیا اور تین تین فٹ کے گڑھے کھود کر ان میں ان کے سر کے بال وغیرہ ڈلوائے گئے۔ کئی عورتوں اور لڑکیوں کے بھی سر کے بال کٹوا دیئے۔ کیوں کہ ایک عجیب قسم کی جوئیں پڑ گئیں تھیں جو کہ ٹڈی کی طرح اڑتی تھیں۔ کئی عورتیں تو ڈی سی کی مہربانی سے ہمارے کیمپ میں لائی گئیں۔ جس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنی ہوتی تھی اسے اس کیمپ میں لایا جاتا تھا۔ ہم تب تک انہیں باہر ہی رکھتے تھے جب تک کہ ان کے کپڑے وغیرہ ابالے نہیں جاتے تھے۔ ان سے ایک عجیب قسم کی بدبو آتی تھی۔

ایک دن ڈی سی نے دو تین خاندان ہمارے کیمپ میں بھیجے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر جو ہے آج کل دہلی میں ہیں، میرپور کا مشہور گوکس شاہ نامی شخص بھی انہیں میں تھا۔ اس کا ایک بیس برس کا لڑکا مار دیا گیا تھا۔ اس کی بیوی اور دو تین بچے تھے۔ وہ مسلمان تو بن گیا تھا لیکن وہاں کے مسلمان اسے ہر روز پکڑ کر لے جاتے تھے اور باندھ کر لاٹھیوں سے مارتے تھے۔ کہتے تھے، "بتا تو نے اپنی دولت کہاں گاڑ رکھی ہے" کہتے ہیں اس نے کچھ روپے کہیں گاڑھے

تھے وہ نکال کر انہیں دے دیتے تھے۔ لیکن اب بھی وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کی ایک سولہ برس کی لڑکی تھی۔ اس نے اس کی ایک سیّد سے شادی کر دی۔ لڑکی میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی اور ہونہار اور خوبصورت تھی۔ دو مہینے اس لڑکے نے اُسے رکھا۔ تیسرے مہینے اُس نے کہا وہ اُسے نہیں رکھ سکے گا اور کسی کو سونپ دے گا۔ لڑکی نے کہا کہ اب وہ اُسی کی ہے۔ ہندو لڑکی کی شادی ایک بار ہوتی ہے اسی کو وہ اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ وہ فوج میں تھا۔ اس لڑکی نے اس سے بندوق چلانا سیکھ لی تھی اس کی پہلی بیوی بھی تھی۔ ایک دن اس لڑکی نے موقعہ پا کر بندوق ہاتھ میں لی اور بیٹھ کر اپنے ماتھے پر وار کر لیا۔ گولی لگتے ہی اس کے سر کی کھوپڑی پھٹ گئی۔ جب وہ گھر آیا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی نہیں بولا تو دروازہ توڑ کر اندر آیا۔ وہاں لاش دیکھی تو اٹھا کر یہ کہتے ہوئے باہر پھینک دی "کافر لڑکی تمھارا یہی ہونا تھا" اُس حادثے کا گاؤں میں بڑا چرچا ہوا۔ اس کے یہاں کا گاؤں والوں نے کھانا پینا تک بند کر دیا۔

تبھی سنا گیا کہ ہماری فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہمارے کیمپ میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ ڈر لگا۔ بھاگتے ہوئے پاکستانی اور قبائلی یہاں آئیں گے اور سب کو قتل کر دیں گے۔ میں نے عورتوں کو سمجھایا "تمھیں خوش ہونا چاہیئے۔ ہماری فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہاں ایک افسوس ضرور ہے کہ یہاں گھاس لکڑی نہیں ملے گی ورنہ ان کے یہاں پہنچنے تک ہم جوہر کی رسم ادا کرتے۔"

ایک دن ڈی سی کا بھتیجا آیا اور مجھ سے بولا "آج ہندوستان نے اپنے باپو کو اپنے ہاتھوں مار دیا ہے۔ اب تمھارے ہند کا خدا ہی رکھوالا ہے۔ برے دن دکھائی

دے رہے ہیں"۔ یہ منحوس خبر سن کر کسی کو سدھ بدھ نہیں رہی۔ سارے کیمپ میں ہاہاکار مچ گیا۔ "ہائے باپو! تم بھی اس مصیبت میں ہمیں چھوڑ گئے۔ تمھاری ہی امید پر تو ہم یہاں بیٹھے ہوئے تھے" یہ کہہ کر سب رونے لگے۔

ان دنوں پاکستان کے جاسوس جگہ جگہ پر گھوم گھوم کر یہ کہہ رہے تھے "دیکھو کافر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر تمھارے گاؤں میں پہنچیں، بھاگنا نہیں۔ چپے چپے پر مقابلہ کرنا" اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی فوجیں زوروں سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ انہی دنوں دو غیر ملکی بہنیں اور غیر ملکی بھائی ریڈ کراس کی سوسائٹی کی طرف سے کیمپ دیکھنے آئے تھے یہ کٹ پیسوں کی ایک دو پیٹیاں صابن اور دودھ وغیرہ ساتھ لائے تھے۔ اکثر وہ میرے کمرے میں آکر بیٹھتے تھے۔ کٹ پیس کی پیٹیاں انہوں نے میرے سپرد کیں۔ میں نے سب بہنوں کو بلا کر دو دن میں ان چار چار گرہ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر کپڑے سیئے۔ انہوں نے لے کر کیمپ میں بانٹ دیئے۔ ان کے آنے سے کچھ بھروسہ ہوا۔ تبھی پاکستان کا پناہ گزینوں کا وزیر غضنفر علی خاں دو ساتھیوں کے ساتھ وہاں آیا کیمپ کمانڈنٹ کے ساتھ میرے کمرے میں بھی آیا اور آتے ہی ایک انجان شخص کی طرح مجھ سے پوچھنے لگا "کیا اس کیمپ میں صرف عورتیں ہی ہیں۔ تمھارے خاوند کہاں ہیں؟" میں نے کہا "معاف کیجئے، کیا آپ کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں؟" یہ سن کر وہ جھینپا۔ میں نے کہا "وہ تو شہید ہو گئے لیکن ابھی تک یہ خون کی ہولی چل رہی ہے نہ جانے یہاں کی بے گناہ عورتوں کا چھٹکارا کب ہوگا" کیمپ کا انچارج کہنے لگا "دیکھئے آزاد کشمیر کی فوج کے کرنل وغیرہ یہاں لڑکیاں لینے آتے ہیں لیکن میں اپنے جیتے جی یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ میں دنیا کو بتا دوں گا کہ سچا اسلام کیا ہے اور کیا

کہتا ہے"۔ غضنفر علی بولا "ہم جلدی ہی تم سب کو ہندوستان بھجوانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

اس کے بعد ایک دن ڈی سی نے مجھ سے کہا "تمھیں تو بھیج دیتے ہیں باقی کیمپ ابھی یہیں رہے گا۔ ابھی ہماری بہت سی بہنیں ہندوؤں کے گھروں میں ہیں" میں نے اُس سے کہا "میں انہیں وچن دے چکی ہوں کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ جموں کشمیر میں جا کر ہندوؤں کے یہاں سے اپنی بہنیں نکلواؤں گی"۔ جب میں ہندوستان آئی تو اپنے وچن کو پورا کرنے کے لئے کشمیر گئی لیکن وہاں کہیں کسی کے پاس مسلمان بہن نہیں پائی۔

(۲۷)

بھارت ماتا کی جے

آخر ایک دن ڈی سی نے کہلا بھیجا "تیار رہو، شام کو جانا ہے" سب کے دل کھل اٹھے لیکن پھر بھی یہ فکر تھی کہ نہ جانے راستے میں کیا ہوگا۔ اس پر وہ لوگ ڈاکٹر صاحب اور دو تین دوسرے لوگوں کو نہیں بھیج رہے تھے۔ کہتے تھے کہ جب یہ مسلمان بن گئے ہیں تو کیوں جا رہے ہیں؟ کیمپ کے انچارج کو میں نے ڈی سی کے پاس بھیجا۔ آخر وہ مان گیا۔ سب کی پوشیدہ طور پر تیاری ہونے لگی۔ کیمپ کے انچارج نے آکر مجھ سے کہا "تم یہاں کی سب عورتوں کو لے جا رہی ہو۔ اچھا ہے لیکن سنا ہے کہ جو

چڑھ گئے۔ ایک تو کسان معلوم ہوتا تھا دوسرا وردی پوش سپاہی تھا۔ اس لڑکی نے جو میرے پاس بیٹھی تھی مجھ سے کہا "بچائیے، وہ آپہنچا۔ جب وہ ٹرک پر سوار ہوئے تو ٹرک چل پڑا۔ اب وہ کسان عورتوں کو تنگ کرنے لگا۔ کبھی ایک کو دھکا دے کبھی دوسری کو۔ عورتیں چلاتے لگیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اسی لئے ہم کہتے تھے کہ نہیں جائیں گے۔ میں نے سب سے کہا "دینے دو دھکا۔ ابھی ٹرک رکوا کر ہم پوچھتے ہیں کہ بغیر مطلب کے کون یہاں چڑھ آیا ہے" یہ سن کر وہ اٹھا اور ڈرائیور کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ دل میں بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ کہیں یہ اس لڑکی کو لے تو نہیں جائے گا۔ میں اسے کیسے بچاؤں گی؟ ٹیڑھی جگہ ہے۔ ایک دم ٹرک سے اتار کر لے جائیں گے۔ ہم سے کچھ کرتے نہ بنے گا۔ وہ سپاہی مجھ سے کہنے لگا "آپ جانتی ہیں کہ اس لڑکی کے لئے مجھے کتنی دقتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ میرے گھر کے سب لوگ مجھ سے الگ ہو گئے ہیں" میں نے کہا "میں سب سمجھ چکی ہوں۔ تم نے اسے بچایا ہے۔ تمہارے جیسے بہادر بھائی اگر سب ہوتے تو آج کتنی لڑکیاں بچ جاتیں۔ میں تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ بھگوان تمہارا مددگار ہوگا۔ وہ تمہیں اس نیک کام کا پھل دے گا۔ تمہاری وجہ سے یہ لڑکی ہندوستان جا رہی ہے۔" ایسی الٹی سن کر وہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں" میں نے کہا "میں سچ کہہ رہی ہوں بھگوان اچھے برے سب کام دیکھتا ہے" اس نے کہا "اچھا آپ اسے اچھی طرح لے جائیے اور اس کی ماں کے سپرد کر دیجئے" میں حیران رہ گئی کہ ذرا سی دیر میں اس کی عقل کیسے ٹھکانے آگئی تھی۔ ایک جگہ ٹرک رکا وہ اتر گیا۔ اصل میں اس نے ہی اس بدمعاش کسان کو چڑھایا تھا کہ وہ ذرا شور شر مچائے تو شاید [illegible] ہمارے ٹرک سرائے [illegible] پہنچے

لڑکی تمہارے پاس ہے اور دوسری جسے پولیس کا افسر رکھنا چاہتا ہے انہیں راستے میں اڑانے کی سازش ہو رہی ہے!" بڑی مشکل پیش آئی۔ میں نے ان دونوں کے سر کے بال کھلوا کر ان کا عجیب سا لباس بنایا۔ گرم پھٹے ہوئے کمبل اوڑھاتے۔ کمر جھکا کر چلنے کو کہا۔ شام کے وقت سب لوگ نکلے۔ ان لڑکیوں کو لینے کے لئے سپاہی آیا ہوا تھا۔ اس نے سب سے کہا "دیکھ دیکھ کر عورتوں کو جانے دینا" وہ سب دیکھ دیکھ کر آگے بھیجنے لگتے جو آگے نکل جاتی اسے ڈانٹ کر روکتے تھے۔ ان لڑکیوں کو میں نے بیچ میں رکھا۔ کبھی ان کے آگے رہتی تھی کبھی پیچھے۔ وہ دونوں کانپ رہی تھیں۔ بھگوان کی کرپا سے وہ اندھیرے میں پہچانی نہیں گئیں۔ ہمیں تقریباً ایک میل پیدل چلنا تھا۔ آگے ٹرک تھے۔ پاکستان کا کیمپ کمانڈر بھی وہاں تک ساتھ آیا تھا اور ڈی سی نے میرے پاس کنٹرول افسر کو بھیجا تھا کہ انھیں اچھی طرح بٹھا دینا۔ بہت سے ٹرک قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ریڈ کراس کی وہ غیر ملکی بہنیں اور صاحب بھی تھے۔ ان کی کار ساتھ تھی جس سے سب کو بڑا سہارا ملا۔ راستہ آرام سے کٹنے کی امید بندھی۔ سب عورتیں میرے آگے پیچھے تھیں اور کہتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں۔ میں نے سمجھایا کہ سب کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟ تم بے خوف ہو کر بیٹھو۔ میں نے سب کی گنتی کر کے انہیں ٹرک پر سوار کرلیا۔ عورت بچے مرد سب مل کر لگ بھگ اکیاسی تھے۔ سب کے پیچھے والے ٹرک پر میں بیٹھی۔ سب بچے اور وہ دونوں لڑکیاں جنہیں میں مشکل سے لائی تھی میرے ساتھ تھیں۔ ٹرک چلانے والے سب ڈرائیور پٹھان تھے۔ ان کے ساتھ کچھ فوجی سپاہی بھی تھے۔ یہ لوگ ہمیں کچھ ان نظروں سے گھور گھور دیکھتے تھے کہ ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے کب کیا ہو جاتے۔ ہمارا ٹرک دس قدم چل کر رکا تو اس پر دو آدمی

وہاں سب کو اتارا۔ ایک ٹرین پر بٹھا دیا گیا۔ اس میں علی بیگ کیمپ کے بھی شرنارتھی تھے۔ سب ٹرین پر چڑھ گئے۔ لیکن میں آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ ایک ڈبے میں کچھ سپاہی تھے۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے "اس ڈبے میں بیٹھئے" لیکن بھگوان بروقت مدد کرتا ہے۔ میں آگے چلی گئی اور بیچ والے ڈبے میں سوار ہوئی۔ میں، وہ دونوں لڑکیاں شریمتی مودی اور سب بچے ایک ساتھ تھے صرف دونوں نوکر اور میرا بیٹا سرتش چھوٹ گیا۔ وہ کہیں اور بیٹھ گئے ہوں گے یہ سوچ کر ہم چپ ہو گئے۔ ڈبے میں بہت بھیڑ تھی۔ جیسے تیسے اندر گھسے۔ رات کا وقت تھا کسی نے دیا سلائی جلا کر کچھ روشنی کی۔ دیکھا کہ علی بیگ کیمپ کے کچھ مرد عورتیں اور بچے ہیں۔ سب عورتوں کو بڑی مشکل سے بٹھایا۔ لیکن مجھے بیٹھنے کیلئے جگہ نہ ملی میں کھڑی رہی۔ جس لڑکی کو میں لائی تھی، اس کا چاچا ملا۔ میں نے اسے اس کے سپرد کر دیا۔ وہ بہت شکریہ ادا کرنے لگا ہمیں ساری رات اسی اندھیری ٹرین میں کاٹنی پڑی۔ صبح چار بجے اُسے ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا۔ مارے خوف کے کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ بدبو تھی کہ سانس لینا مشکل تھا۔

کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ایک وردی پوش پاکستانی سپاہی گاڑی میں چڑھا جہاں سامان کی سیٹ ہوتی ہے۔ وہاں ہمارے کیمپ کی ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جاگیردار کا خاندان ہمارے کیمپ میں رہتا تھا وہ اسی خاندان کی تھی۔ یہ وہاں سے اچھی طرح آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری لڑکی شیلا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سپاہی اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اس کے پاس بچہ تھا۔ اس نے کہا "میں بچہ چھوڑ کر آتی ہوں" اس نے نیچے چھلانگ لگائی اور سیٹ کے نیچے چھپ

گئی۔ شیلا نے میرے اوپر چھلانگ لگائی۔ میں اسے لے کر وہاں آئی جہاں باقی لڑکیاں بیٹھی تھیں ابھی میں کھڑی ہی تھی کہ سپاہی نے میرا بازو زور سے پکڑا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ اس نے سنگین نکال کر میری پسلی پر رکھی۔ سب بچے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہنے لگا "بتا تو نے اسے کہاں چھپایا ہے۔ نہیں تو میں ابھی سنگین بھونکتا ہوں"۔ جیسے بجلی کوندی میں نے پکارا "بھگوان یہ کیا جیتی ہوئی بازی ہار رہی ہوں" سامنے وہ عورت سیٹ کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ ایک نگاہ اس کی طرف تھی دوسری بچوں کی طرف۔ ایک خیال تڑپا۔ نہیں کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ اسے بچانا ہی ہوگا۔ میں نے کہا "بھونک دے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس دنیا سے مجھے چھٹکارا ملے" "کیا تو چاہتی ہے کہ تیرا اس دنیا سے چھٹکارا ہو جائے" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے سنگین ہٹا لی اور جس طرف لڑکیاں بیٹھی تھیں اس طرف گیا اور کہنے لگا "یہ کون لڑکیاں بیٹھی ہیں؟ وہ لڑکی نہیں ملی تو ان میں سے ایک لے جاؤں گا" یہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے مرد آواز لگا کر اس عورت سے کہنے لگے "نکل کر چلی جا، بچ جائے گی" جب اس نے مجھ سے پوچھا "یہ لڑکیاں کون ہیں؟" تو میرے منہ سے اچانک نکل گیا "یہ میری بچیاں ہیں" وہ کہنے لگا "سب" اور وہاں سے مڑا۔ لیکن تبھی اس کی نظر سیٹ کے نیچے اس عورت پر پڑ گئی اسے نکالا اور کہنے لگا "تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں تمہیں اس کی سزا دوں گا" وہ کہنے لگی "ویرجی (بھائی) مجھے معاف کرو"۔ اتنے میں اس عورت کی ماں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور چلا کر آواز دی۔ سویرا ہو گیا تھا۔ وہ بھاگ گیا۔ میں تو سمجھتی ہوں بھگوان نے میرا امتحان لیا تھا۔ کچھ بھی ہوا۔ بھگوان نے میرا عہد نبھایا۔ اور ہم سب خیریت سے امرتسر آ پہنچے۔

ایک منزل کا خاتمہ ہوگیا۔ دکھوں کی گھنگھور گھٹا پیچھے چھوٹ گئی۔ نئی زندگی کا سویرا چمکنے لگا۔ جذبات نے دل کو اتنا جکڑ لیا تھا کہ بہت دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ ہم بھارت ماتا کی گود میں پہنچ گئے ہیں۔ گھرے اندھیرے میں سے جب کوئی روشنی میں آتا ہے تو یکایک اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ بھی ہو یہ داستان یہیں ختم ہوتی ہے۔ آگے کی کہانی اگتی ہوئی روشنی کی کہانی ہے۔ اسے سب جانتے ہیں

پنڈت جواہر لال سے ملاقات

جب گاڑی امرتسر پہنچی۔ اسٹیشن پر کھانے پینے کا بہت ہی اچھا انتظام تھا۔ بہت سے بھائی بہنیں مدد کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے ہماری گاڑی رکی۔ سب دکھی بہن بھائی گاڑی سے اترے۔ وہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو آزاد دیکھ رہے تھے۔ لیکن بے بسی کی حالت میں بہت سے بہن بھائیوں کے رشتہ دار وہاں آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا ملاپ بڑا پر درد تھا۔ کوئی دولت کو رو رہا تھا اور کوئی اشخاص کو۔ کھانا پھل، مٹھائی وغیرہ سب کو دیا گیا۔ کئی روز سے سب بھوکے پیاسے تھے۔ سب نے لیا۔ وہاں کئی لکھ پتی بھی تھے۔ وہ بھی بھول گئے کہ آج ہماری یہ حالت ہے کہ پلیٹ فارم پر بھکاریوں کی طرح کھانا لیتے ہوئے بھی ہمیں تکلیف نہیں ہوتی کیوں کہ ہم بھارت ماتا کی گود میں ہیں جہاں پیار ہی پیار ہے

میں اور میرے سب ساتھی ایک کونے میں کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بھوک تھی لیکن ہاتھ آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب نے کھانا ختم کر لیا لیکن ہمیں ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر کچھ بولیں۔ اتنے میں ایک کارکن بہن میرے پاس آئی اور کہنے لگی "بہن کیا وجہ ہے کہ تمھاری پارٹی اس وقت سے ایک کونے میں کھڑی ہے۔ مہربانی کرکے سب باتوں کو بھول کر کھانا کھاؤ۔ تم لوگوں کو یہاں نہیں رہنا ہے۔ کوروکیشتر جانا ہے" میرا اترکا مسرش کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ بھارت میں خود کو اس حالت میں نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ کیوں حوصلہ ہار رہے ہو۔ اب تک ہم نے جو بہادری دکھائی ہے اسے آنسوؤں سے مت دھو ڈالو۔ خود کو سنبھال کر وہ کہنے لگا کہ تم تو کہتی تھیں کہ بھارت پہنچ کر تم اپنے آپ کو بدلا ہوا پاؤ گے۔ دیکھو یہاں بھی اپنا کوئی نہیں ہے۔ آہ! مجھ سے وہ درد برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ میں اس کی تکلیف کو جانتی تھی لیکن اس وقت اس کا حل میرے پاس نہ تھا۔ وہ بہن کچھ کھانے کا سامان لے آئی سب نے تین دن کی بھوک پیاس مٹانے کے لئے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ اب سب کوروکیشتر جانے کے لئے گاڑی پر سوار ہونے لگے۔ کچھ لوگ وہیں امرتسر میں رہ گئے کیونکہ انہیں اپنے رشتہ دار مل گئے تھے۔ میں ابھی کوروکیشتر جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن امرتسر میں رہنے کی بھی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ میں نے وہاں کھڑے ہوئے ایک شرنارتھی افسر سے کہا۔ "میں کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ ہمارے لئے اس کا انتظام کر سکتے ہیں؟" اس نے جواب دیا کہ کشمیر کے شرنارتھیوں کا انتظام کوروکیشتر میں کیا گیا ہے۔ آپ یہاں نہ رہیئے۔ اسی وقت ایک عورت میرے پاس آئی جس کی عمر پینتالیس برس سے اوپر ہی ہوگی۔ اس نے بڑی محبت سے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟ کیا آپ مجھے اپنا کچھ تعارف

کرا سکتی ہیں۔ میں نے اس سے اپنا کچھ تعارف کرایا۔ سن کر وہ کہنے لگی "میں یہاں کالج میں کیمپ آفیسر ہوں۔ یہاں پر اغوا کی ہوئی ہندو مسلمان بہنیں لائی جاتی ہیں۔ ہم انھیں ان کے رشتہ داروں کے پاس جگہ جگہ پر بھیجتے ہیں۔ جن کے رشتہ دار پاکستان میں ہیں انھیں پاکستان میں اور جن کے یہاں ہیں انھیں ان کے سپرد کرتے ہیں جن کا کوئی نہیں ان کا انتظام حکومت کرتی ہے۔ اس نے اپنا نام بی بی سنت کور بتایا اور مجھ سے کہنے لگی" آپ سب میرے ساتھ چلیں۔ میں کیمپ میں سارا انتظام کر دوں گی۔ میں سرکار کو مجبور کروں گی کہ جب تک آپ وہاں رہیں وہ آپ کا انتظام کرے۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں خود اپنے پاس سے خرچ کروں گی۔ میری آتما مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں آپ کی مدد کروں" اس کیمپ میں سرکار کی طرف سے ان لڑکیوں اور عورتوں کا انتظام ہوتا تھا جو لوگوں کے گھروں سے برآمد کی جا رہی تھیں۔ اس لئے بی بی سنت کور کو وہاں ہمیں رکھنے اور خرچ وغیرہ کے لئے ذمہ دار افسروں سے پوچھنا ضروری تھا۔

میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں کچھ دن یہاں اس کے پاس رہوں گی۔ اور میرے سب ساتھی جانے کو تیار ہو گئے میں نے اپنے ساتھ والی کیمپ کی بہنوں سے اجازت لی۔ ان سے کہا کہ جب بھی وقت ملیگا میں انکے پاس آؤں گی اور ان کی خدمت کروں گی۔ اب وہ بھارت میں ہیں۔ فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بی بی سنت کور ہمیں اپنے کیمپ میں لے گئیں۔ اپنے کمرے کے ساتھ ہمیں کمرہ دیا۔ ہمارے آرام کا سارا انتظام کیا۔ اور وہ یہ سب بڑی محبت سے کر رہی تھیں۔ یہ ہماری نئی زندگی کی پہلی منزل تھی۔ ہم نے رات آرام سے کاٹی۔ صبح بی بی سنت کور کہیں باہر چلی گئیں۔ دس بجے لوٹ کر مجھے بتایا کہ وہ وہاں فوج کے برگیڈیر کے پاس گئی تھیں۔ وہ ابھی ہم سے ملنے آئیں گے۔ بڑے نیک آدمی ہیں۔ میں ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ ان کا نام انہوں نے برگیڈیر مہندر سنگھ

جی چوپڑہ بیتایا۔

۱۲ بجے شری ہندر سنگھ جی چوپڑہ اور ان کی بیوی تشریف لائے۔ وہ سب بچوں کیلئے کپڑے وغیرہ لائے تھے انہوں نے مجھ سے سب حال پوچھا اور کہا "بہن! جہاں تک ہوگا۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ تم کچھ دن یہاں رہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ اسے اپنی سب باتیں لکھوادیں وہ میں کشمیر کے پردھان منتری کے پاس بھجوا دوں گا تاکہ آپ کا کچھ انتظام ہو سکے"۔ میں نے کہا "میں ابھی دلی جانا چاہتی ہوں۔ شری پنڈت جواہر لال نہرو، پردھان منتری بھارت سرکار کے پاس۔ بعد میں سب طے کروں گی"۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا لایا ہوا سامان قبول کروں۔ ہمیں ضرورت بھی تھی پاس بھی کچھ تھا نہیں۔ لیکن اپنی حالت پر دل دکھی ہو رہا تھا۔ جب شری ہندر سنگھ مجھے سامان دینے لگے تو میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ کبھی دان دینا کبھی دان لینا۔ دکھے جیون پر بھی خوشی میں ہی رہنا۔ میری یہ حالت دیکھ کر میاں بیوی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

پھر ملنے کو کہہ کر وہ چلے گئے اور اپنا ایک آدمی میرے پاس بھیجا۔ اس نے کچھ باتیں مجھ سے پوچھ کر نوٹ کر لیں بی بی سنت کور نے مجھے بتایا کہ آج شام کو چار بجے مظفر آباد سے شرنارتھیوں کی گاڑی آنے والی ہے۔ انہیں اسٹیشن پر مٹھائی وغیرہ دی جائے گی۔ میں نے بی بی سنت کور سے کہا "میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی"۔ بچوں نے بھی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ بعد میں میں نے سارا کیمپ گھوم کر دیکھا۔ پنجاب سے جو مسلمان بہنیں لوگوں کے گھروں سے سرکار کی طرف سے لائی گئی تھیں ان کے رہنے سہنے کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہیں وقت پر پھل، دودھ وغیرہ سب ملتا ہے اور ان کے دل بہلاوے کے لئے سلائی، کشیدہ کاری وغیرہ ان کو سکھائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی سنیما وغیرہ دکھانے کا بھی انتظام کیا جاتا ہے

اتنا کچھ ہونے پر بھی وہ خوش نہ تھیں۔ ان کی ناامید آنکھیں ان کی ساری دکھ بھری کہانی سناتی تھیں۔ انہیں اس وقت تک اس کیمپ میں رکھا جاتا تھا جب تک کہ ان کے رشتہ داروں کا پتہ نہ چلتا تھا۔ پہرے کا اچھا انتظام تھا۔ کوئی غیر آدمی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اندر کام کرنے والی سب عورتیں ہی تھیں۔ کیمپ کی صفائی وغیرہ بہت ہی اچھی تھی۔ شام کے چار بجے میں بچوں کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچی مظفر آباد کے شرنارتھیوں کی گاڑی آئی۔ سرکار کی طرف سے ان کے کھانے پینے کا انتظام تھا۔ ہم سب نے اپنے ہاتھوں سے ان میں مٹھائی وغیرہ بانٹی۔ مجھے سب اپنے وہاں کے واقف کار ملے۔ شری چمن لال وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ہو سکا تو میں بھی کوروکشیتر آؤں گی اور جہاں تک بن پڑا ان سب کی کچھ خدمت کروں گی۔ دیکھتے دیکھتے ان کی گاڑی پلیٹ فارم پار کر گئی۔

اس کیمپ میں بھی مجھے تھوڑا بہت کام کرنے کو مل گیا تھا۔ گھنٹوں بیٹھ کر کیمپ کی بہنوں کو سمجھاتی رہتی تھی ان پر اثر ہوتا تھا۔ وہاں ہندو بہنیں بھی لائی جاتی تھیں جو حکومت کی طرف سے پاکستان کے مسلمان گھروں سے نکالی جاتی تھیں۔ انہیں یہاں نئے کپڑے وغیرہ پہنا کر جالندھر کے کیمپ میں بھیجا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ میں بھی انہیں پہنچانے جالندھر گئی۔ کام کرنے کی دل میں بڑی امنگ تھی لیکن پریشانیوں کے باعث جسم کافی کمزور ہو گیا تھا۔ زیادہ محنت نہ ہوتی تھی۔

امرتسر پہنچنے پر میں نے اخباروں میں اپنا ایک بیان دیا۔ جس سے میرے رشتہ داروں کو معلوم ہو گیا کہ میں امرتسر پہنچ گئی ہوں۔ انہوں نے اپنے واقف کاروں کو تار دے دیئے تھے کہ میری کچھ امداد کریں۔ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آتے اور سب چلا

پوچھا اور خواہش ظاہر کی کہ ہم ان سے کچھ امداد لیں لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے بتایا کہ کشتواڑ میں (جہاں کی میں رہنے والی ہوں) کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ہندو مسلمان بڑی محبت سے رہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن میں کوئی ایسی حرکت نہیں ہونے دی جس سے وطن کی شان میں فرق آتا۔ وہاں کی جنتا نے اتحاد کی ایک مثال قائم کی ہے۔ لیکن اس کے پڑوسی علاقے بھدرواہ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کا (یعنی میرا) بہنوئی قتل ہو گیا۔ یہ خبر میرے لئے بڑی پریشان کن تھی لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میری بہن لکشمی جو کچھ بیمار رہتی تھی کیسے اپنے تین بچوں کو لے کر زندگی کی یہ دکھ بھری منزل پار کرے گی؟ یہ سب باتیں میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگیں۔

میرے جیٹھ (شوہر کے بھائی) کا تار ہوشیارپور کے ان کے ایک دوست کو ملا کہ ہمیں ان کی طرف سے خرچ کے لئے کچھ روپیہ دیا جائے۔ اور رہنے وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ ان کے وہ دوست میرے پاس امرتسر آئے اور بچوں کے لئے کچھ روپیہ دیا اور کہا کہ وہ ابھی کشتواڑ سے نہیں آسکتے ہیں کیوں کہ راستے میں کچھ گڑبڑ ہے۔ تب تک ہم آپ کے رہنے وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے ساتھ جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ انہی دنوں شریمتی مودی کا لڑکا جموں سے ماں کو لینے آیا۔ ان کا ملاپ دل میں بڑا حسرت ناک تھا۔ شریمتی مودی کے دو بچے سرینگر میں پڑھتے تھے۔ ایک چھٹیوں میں ان کے پاس مظفرآباد میں آیا ہوا تھا جس کے بارے میں میں پہلے پہلے لکھ چکی ہوں۔ شریمتی مودی نے مجھ سے کہا "تم بھی جموں چلو۔ یہاں کیا کرو گی" میں نے اُسے کہا کہ میں دیش سیوا کرنے کا عہد کر چکی ہوں جب تک یہ سب انتظام نہیں ہو گا میں [illegible] میں رہوں گی۔ کملا کو شریمتی مودی اپنے ساتھ لے گئیں

اب یہاں رہتے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا تھا جسم میں کچھ کچھ طاقت بھی آ گئی تھی ایک دن میں نے بی بی سنت کور سے کہا کہ اب میں دلّی جاؤں گی اس نے کہا شری کالی پرشاد جی سے پوچھ کر سب ہو گا۔ چلو ان سے بات کریں۔ شری کالی پرشاد جی مس مردولا سارابائی کے سیکریٹری تھے جو ان کی طرف سے امرتسر میں شرنارتھیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے ان کا دفتر امرتسر ہوٹل" میں تھا۔ شری کالی پرشاد جی ایک قابل شخص تھے۔ ان کا برتاؤ سب سے ہمدردانہ تھا اور جہاں تک ہو سکتا تھا وہ سب کی امداد کرتے تھے۔ میں بھی اپنے بارے میں کبھی کبھی ان سے مشورہ لیتی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اب میں دلی جانا چاہتی ہوں۔ وہ بولے "ٹھیک ہے جاؤ لیکن تم وہاں سے بالکل ناواقف ہو۔ کیسے چھوٹے چھوٹے بچے لے کر وہاں رہو گی؟" میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ اب تک کون ساتھ تھا جس نے اب تک حفاظت کی ہے وہی آگے بھی انتظام کرے گا!"

دوسرے دن صبح ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ بی بی سنت کور اور شری کالی پرشاد جی ہمارے ساتھ اسٹیشن پر آئے۔ بھگوان کا کرنا اسٹیشن پر پہنچتے ہی سب دلی کے بجائے کوروکشیتر جانے پر مجبور کرنے لگے کہ اچھا یہی ہے کہ کچھ دن آپ کوروکشیتر میں رہیں۔ وہاں سے دلی جائیں۔ بی بی سنت کور نے کیمپ کمانڈر کوروکشیتر کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیا۔ پانچ بجے بنوں اور سرحد کے شرنارتھیوں کی گاڑی آرہی تھی۔ اسی میں ہمارا جانا طے پایا۔ اور ہم اس گاڑی سے کوروکشیتر کے لئے روانہ ہو گئے۔ بڑی بھیڑ تھی۔ خیر جیسے تیسے یہ سفر بھی طے کیا۔ صبح کوروکشیتر پہنچے۔ گاڑی رکی۔ سب مسافر اترے۔ تمام سڑکوں پر شرنارتھی ہی شرنارتھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کہاں جاؤں؟ یہاں تو لاکھوں کی تعداد میں شرنارتھی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دکھی ہے۔ اتنے میں ریلوے کا ایک کارکن وہاں سے گذرا

اس نے ہماری طرف دیکھا اور رکا۔ کہنے لگا کہ آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟ میں نے کہا "میں یہاں کے کیمپ کمانڈر سے ملنا چاہتی ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں رہتے ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "آپ سب میرے ساتھ چلئے۔ میرے گھر پر ٹھہریئے۔ میں آپ کے نوکر کو اس کا دفتر بتا دوں گا۔" میں اور بچے اس کے گھر پر گئے جو پاس ہی تھا۔ اس کی بیوی نے بچوں کے لئے چائے وغیرہ بنائی۔ تب تک اوم دفتر دیکھ آیا۔ تب میں نے بی بی سنت کور کا خط اُسے دیا اور وہ اسے لے کر کیمپ کمانڈر کے پاس گیا۔ انہوں نے خط پڑھ کر اوم سے کہا "وہ کہاں ہیں؟" یعنی میری بابت پوچھا "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" اوم میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ کو کیمپ کمانڈر صاحب بلاتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ گئی۔ کیمپ کمانڈر کرنل پوری سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔ انہوں نے بڑے دھیان سے میری بات سنی اور کہا "بہن جی! آپ میری مہمان ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔ وہاں میں نے اپنے مہمانوں کے لئے خیمے لگوائے ہیں وہیں آپ ٹھہریئے۔" اس نے اپنے گھر پر فون کیا۔ اسی وقت اس کی بیوی آئی اور مجھے اور بچوں کو موٹر میں لے گئی۔ انہوں نے وہاں ہمارا تمام انتظام کیا۔ ہم بڑے آرام سے وہاں رہنے لگے۔ کرنل پوری کی بیوی اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی دن بھر شرنارتھیوں کے کیمپ میں کام کرتی تھیں۔ کیمپ میں انھوں نے ایک سینٹر کھولا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور جب شرنارتھیوں میں کپڑے وغیرہ بانٹنے ہوتے تھے۔ تب اپنے ہاتھ سے بانٹتی تھیں۔ ان کے سارے خاندان میں خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ایک دن کرنل پوری نے سب کیمپ مجھے دکھائے۔ ان دنوں وہاں تقریباً ۲ لاکھ شرنارتھی تھے۔ میں نے کرنل پوری سے کہا کہ جب تک میں یہاں ہوں کچھ تھوڑا کام مجھے بھی دیں۔ ان بہن بھائیوں کی خدمت کرنے میں مجھے خوشی حاصل ہوگی۔ شری پوری نے مجھے تھوڑا

کام سونپا۔ میں ہر روز کیمپ میں جاتی تھی۔ وہاں مجھے شری چمن لال جی اور شری شیودیال جی وغیرہ سب ملے۔ شری شیودیال کو میں نے کسی کام پر لگوا دیا۔ شری چمن لال کی بہن کو بھی ایک سلائی وغیرہ کے سکول میں کام دلوا دیا۔ اپنے ساتھ کے دکھی بہن بھائیوں کی خدمت کرنے کا مجھے یہاں کافی موقع ملا۔

اب مجھے کوروکشیتر میں رہتے ہوئے تقریباً دو ہفتے ہو گئے تھے۔ ایک دن میں نے شری کرنل پوری سے کہا کہ میں دہلی جانا چاہتی ہوں۔ میں نے پاکستان میں ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں پنڈت جواہر لال جی نہرو کے درشن کرتے دہلی جاؤں گی۔ کرنل پوری نے کہا "آپ کا ایسے جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ آپ ایک درخواست لکھیئے۔ اس میں ملنے کا وقت پنڈت جی سے مانگیئے میں وہ درخواست دہلی بھجوا دوں گا۔" میں نے ایسا ہی کیا۔

ایک دن کرنل پوری نے مجھ سے کہا کہ شریمتی مہتا! دہلی سے مجھے فون آیا ہے کہ پنڈت جی یہاں آ رہے ہیں اور آپ کو بھی اس درخواست کے مطابق ملنے کا وقت دیا ہے: دو بجے دوپہر!

کرنل پوری کا سارا خاندان ہمارا خاص خیال رکھتا تھا۔ کبھی کبھی گھنٹوں بیٹھ کر ہم اپنے دیس، بھارت کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ جب میں پاکستان سے آئی تو میں سوچتی تھی کہ یہاں، بھارت میں بھی لوگ پاکستان کی طرح ہر وقت جنگ کے بارے میں باتیں کرتے ہوں گے۔ جیسے وہاں گھر گھر جنگ کا پرچار ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو ایسی کوئی بھی بات سنائی نہیں دیتی۔ سب مزے سے کھا پی رہے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں۔ میں جب پاکستان سے آئی تو سوچتی تھی کہ یہاں، بھارت کے لوگ اپنے سب آرام چھوڑ کر دیش کو مصیبتوں سے بچانے کی کوشش میں لگے ہوں گے

لیکن میری حیرانی کا ٹھکانہ نہ رہا جب میں نے یہاں سب کو مست پھرتے ہوئے پایا۔ پنڈت جی کے آنے کا دن آگیا۔ مجھے کرنل پوری نے کہا "آپ دو بجے دوپہر کو وہاں پہنچ جائیے جہاں پنڈت جی کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ میں وہاں گئی۔ مجھے مقررہ وقت پر پنڈت جی کے پاس لے جایا گیا۔ پنڈت جی ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے سامنے گئی۔ ایک دم میرا سر ان کے آگے جھک گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک عظیم شخص کے سامنے کھڑی ہوں ان کے گنوں نے مجھے جھکا لیا ہے۔ رہ رہ کر میرے دل میں یہی آواز اٹھتی تھی کہ "یہاں انصاف ہے۔ یہاں امن ہے" لمحہ بھر میں گذرے ہوئے چھ مہینے کی سب باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں میں نے جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اتنے میں ایک میٹھی لیکن ہمت دینے والی آواز میرے کان میں پڑی "بیٹھو بیٹھ کر اپنا حال سناؤ"!

میں نے کچھ تھوڑا سا اپنا تعارف کرایا۔ اور کہا "کہ میں اپنا مستقبل دیس سیوا میں لگانا چاہتی ہوں رہے بچے۔ انہیں تعلیم کی ضرورت ہے۔ جیسا آپ اچھا سمجھیں کریں۔ میں سب کچھ آپ پر چھوڑتی ہوں پنڈت جی نے بچوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی میں نے کہا چار بجے کرنل پوری کے یہاں چائے پر آپ آ رہے ہیں وہیں دکھا دوں گی۔ پنڈت جی نے کرنل پوری سے بچوں کی بابت پوچھا۔ چار بجے پنڈت جی کرنل پوری کے یہاں تشریف لائے۔ میں بچوں کو ساتھ لے کر گئی پنڈت جی نے باری باری بچوں سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ پہلے تعلیم اور بعد میں دیش سیوا۔ پنڈت جی نے مجھ سے کہا کہ تم میرے ساتھ دہلی چلو۔ وہاں بچوں کے سکولوں وغیرہ کا انتظام کر کے پھر آکر انہیں لے جانا۔ میں پنڈت جی ہی کی موٹر میں بیٹھی۔ راستہ بھر انہیں اپنی آپ بیتی سنائی۔ پنڈت جی

کی جائے رہائش پر پہنچی۔ اس وقت وہاں شریمتی کرشنا ہاتھی سنگھ (پنڈت جی کی بہن) تھیں۔ انہوں نے بڑے پریم سے میرے ٹھہرنے وغیرہ کا انتظام کیا۔ یہ سب لوگ کہیں کھانے پر جا رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آئی۔ جہاں میرے رہنے کا انتظام تھا۔ میرے لئے اس گھر کی سب باتیں نئی تھیں۔ رات کے دس بجے پنڈت جی دعوت سے لوٹے اور میرے کمرے میں آئے۔ میں نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ پنڈت جی کہنے لگے "کرشنا! تم میری بہن ہو۔ تم اپنے آپ کو نہرو خاندان سے الگ نہ سمجھنا۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہی بچوں کی پڑھائی اس کا میں خود انتظام کر دوں گا"! بہن کا لفظ میرے لئے بہت تھا۔ میں خود کو اس قابل نہ سمجھتی تھی جس خاندان نے اپنے دیش کے لئے اتنی بڑی بڑی قربانیاں دی ہوں۔ اتنے اونچے اونچے کام کئے ہوں۔ ان میں خود کو شامل کرنا ایک ذمہ داری رکھتا تھا۔ میں نے پنڈت جی کو جواب دیا کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی ہوں کہ آپ کی بہن کہلاؤں۔

ایک ہفتہ میں وہیں رہی۔ بعد میں کروکشیتر آکر سب بچوں اور اوم کو لے کر دہلی لوٹی۔ ہم سب پنڈت جی کی جائے رہائش پر رہے۔ ہماری دیکھ بھال بہت اچھی طرح ہوتی تھی۔ شریمتی اندرا گاندھی (پنڈت جی کی لڑکی) ہر طرح سے ہمارا دھیان رکھتی تھیں۔ ان کے اس محبت بھرے سلوک نے ہمارے بہت سے دکھوں کا خاتمہ کر دیا اور دنوں میں ہماری کھوئی ہوئی صحت لوٹ آئی۔ تقریباً دو ماہ تک ہم وہاں رہے اس عرصہ میں پنڈت جی نے بچوں کے اسکول کا انتظام کیا۔ برلا ودیا مندر نینی تال میں انہیں پڑھنے کے لئے بھیجا گیا۔

میں نے پنڈت جی سے کہا کہ میں کشمیر جا کر کچھ سیوا کرنا چاہتی ہوں۔ مئی ۱۹۴۶ء

میں پنڈت جی کشمیر گئے۔ میں ان کے ساتھ گئی۔ سرلش بھی میرے ساتھ آئی۔ وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ اوم کو دلی کی ایک موٹر کمپنی میں کام سیکھنے کے لئے بھرتی کرا دیا۔

یو سی آر ڈبلیو کی جو سنستھا دلی میں ہے اس کی طرف سے مجھے کشمیر کے شرنارتھیوں کے لئے کچھ کام سونپا گیا۔ میں نے کشمیر پہنچ کر سب کیمپ دیکھے اور کیمپ کی عورتوں کو کام کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن کوئی تیار نہ تھی۔ بہت کہنے سننے پر ۱۳ عورتیں تیار ہوئیں۔ میں کام کے ذریعے ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے انہیں مدد دینا مجھے پسند نہ تھا۔ چاہتی تھی کہ ان سے ایسا کام لیا جائے جس سے ان کے لئے آگے کی زندگی گزارنا کچھ آسان ہو جائے۔ سب سے پہلے ان کو دل اور دماغ قابو میں رکھنے کا سبق سیکھنا چاہیئے۔

میں نے سوچا، یہ ایسے ہو سکتا ہے، کہ ایک کام کا مرکز کھولا جائے۔ اس میں انہیں کچھ کام سکھایا جائے۔ اور جو بھی امداد دینا ہو اسی مرکز کی طرف سے دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں لیکچر دے کر ذریعے ان کے مفاد کی سب باتیں سمجھائی جائیں۔ ان ۱۳ عورتوں کو لے کر میں نے کام کرنے کا ایک مرکز کھولا۔

مجھے ایسا کام کرنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ میرا بھائی اوم پرکاش بہت سے مجھے ملنے کے لئے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ چھ ماہ تک میرے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ اس کی ہمت اور مدد سے چھ مہینے میں مرکز نے کافی ترقی کی۔ چھ مہینے میں ۵۰۰ عورتیں اس میں کام کرنے لگیں۔ اس کی ہمیں تین شاخیں اور کھولنی پڑیں۔ بارہ مولا، حبہ کدل اور چھتی بادشاہی۔ مرکز میں نمایاں کام چرخہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے اور بھی کئی کام شروع کئے گئے تھے۔

جب میں نے کام شروع کیا تھا، عورتیں دن بھر اپنے ماضی کو یاد کر کر کے روتی

رہتی تھیں۔ ان کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ مرکز میں سب سے پرارتھنا ہوتی تھی۔ بعد میں لیکچروں کے ذریعے انہیں بہت سی باتیں سمجھائی جاتی تھیں اور یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ کام کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مذہب کے مطابق بھگوان کا بھجن کریں۔ اس سے وہ اپنا رونا دھونا سب بھول گئیں اور دن بھر بڑی ہمت سے کام کرتیں۔ ان کے بچوں کے لئے ایک نرسری سکول کھولا گیا۔ بچوں کے لئے دودھ وغیرہ کا بھی اس میں انتظام تھا۔ اس کے علاوہ فوج کی طرف سے دواخانہ بھی تھا۔ فوج کی طرف سے بھی ہمیں وقت پر بہت مدد ملتی رہتی تھی۔ اب عورتیں خوش تھیں۔ بہت سی مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی رونے کے بجائے ان کے چہروں پر سکون اور اطمینان تھا۔

انہیں دنوں میں نے سنا کہ میری بہن، لکشمی، اپنے شوہر کے غم اور کچھ گھر کے اجڑنے کی وجہ سے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکی۔ تین بچوں کو یتیم چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی۔ یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی۔ لیکن میرے کام کرنے کے مرکز میں اس سے بھی بڑھ کر دکھی بہنیں تھیں۔ مجھے ان کی خدمت کرنے کا موقع مل گیا تھا جو میں چاہتی تھی۔